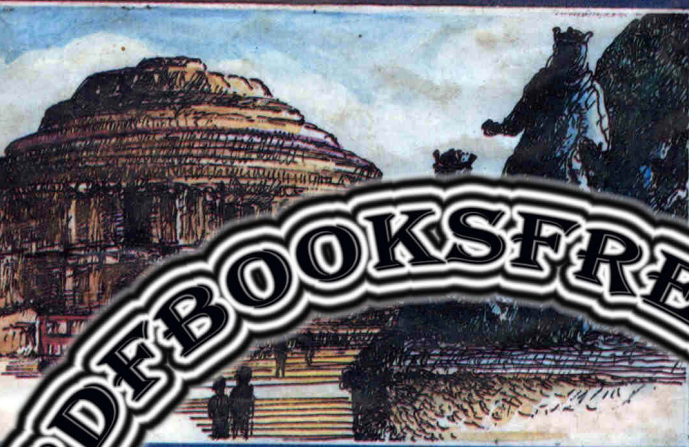
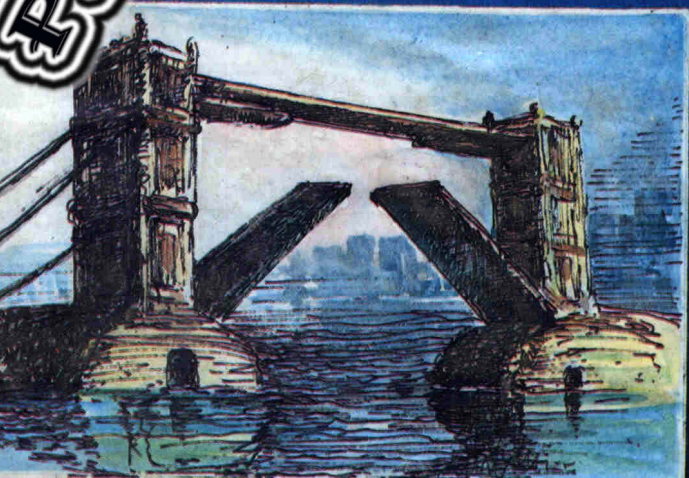


ذرا انگلستان تک

علی سفیان آفاقی



PDFBOOKSFREE.PK



فہرست

۵	ذرا انگلستان تک
۲۲	ردم
۵۷	پیرس جو ایک شہر ہے
۸۴	ذرا ہالینڈ تک
۱۲۲	دو سال بعد پھر لندن
۱۳۱	لندن کے شب و روز
۱۵۰	پولیس اور جرائم
۱۵۶	چوراہوں پر سپاہی
۱۶۲	عربوں کے ٹھاٹ
۱۶۸	ذکر ٹیکسی کا
۱۸۴	ارب پتی مصنف
۱۹۳	اردو مرکز اور استاد دامن
۱۹۷	لوکیشنز کی تلاش
۲۱۳	لندن کے بلیکے
۲۲۱	قصہ پرانے کھیل کا
۲۳۰	باغوں کا شہر
۲۳۶	فٹ بال یا دوال

۱۹۹۶ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اہتمام

ڈاکٹر ظفر مقبول

مقبول ایڈری

۱۹۹۶ء سکررڈر جواک نازکی لاہور

قیمت - / 120 روپے

پرنٹرز: معظم پرنٹرز - لاہور

جہاں دنیا کا شوق پیرا رہا

ذرا انگلستان تک

دنیا کو دیکھنے کا شوق ہمیں ہوش بنبھالتے ہی پیدا ہو گیا تھا۔ بچپن میں جب کوئی پوچھتا "بیٹے۔ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟" تو جواب میں کہتے۔ "سیاح"

کچھ اور عقل آتی تو شوق میں بھی اضافہ ہو گیا۔ محفلوں میں جب سب لوگ پاسٹ کو ہاتھ دکھانے کے بعد اس سے اپنی عمر، صحت اور دولت کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ ہمارا پہلا سوال یہ ہوتا تھا۔

"کیا میرے ہاتھ میں باہر کے سفر کی لکیر ہے؟"

قدرت کو بھی ہمارے شوق کی تکمیل مقصود تھی۔ چنانچہ نو دس برس کی عمر کو پہنچے پہنچتے ہم نے سفر شروع کر دیئے۔ ۱۹۰۷ء تک ہندوستان اور پاکستان میں کافی سیر و سیاحت کی۔ پاکستان کے قریب قریب تمام صوبوں کا پھیرا لگایا۔ یہاں تک کہ مشرقی پاکستان کی بھی سیر کر لی۔ سفر کی خواہش تو پوری ہو رہی تھی مگر "سمندر پار" کے سفر کی حسرت ہی تھی۔ سو وہ بھی ۱۹۰۷ء میں پوری ہو گئی۔ بیرون ملک ہم نے پہلا سفر انگلستان کا کیا۔ اور وہ بھی براستہ یورپ، یعنی چٹیری اور دو دو۔ وہ سارے شہر جنہیں اس سے پہلے ہم نقشے پر اور فضائی کمپنیوں کے اشتہاروں میں دیکھا کرتے تھے اب بنفس نفیس

شہر چھان رہے تھے۔ اب فلم کے یونٹ کو روانہ ہونا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ فلم بندی کا آغاز روم سے ہوگا۔ اگلی منزل کے بارے میں فیصلہ زیر غور تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یونٹ کے دو ارکان ہمارے ساتھ بین ایم کی فلاحیٹ میں سفر کریں گے جبکہ باقی ماندہ یونٹ دودن بعد پی۔ آئی۔ اے کی پرواز سے روم پہنچے گا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک صاحب ہمارے ہم عریار خاں تھے اور دوسرے ہم سے کم عمر منور تھے لیکن ہمیں ان دونوں کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ ان میں سے ایک صاحب تو محض "یس" اور "نو" کی حد تک انگریزی جانتے تھے۔ یار خاں تعلیم یافتہ تھے مگر انھیں انگریزی کی مشق کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا اس لیے بقول ان کے ان کی انگریزی میں "روانگی" نہیں تھی۔ چنانچہ اس کی کوپرا کرنے کے لیے انھوں نے ہماری خدمات بطور مترجم حاصل کر لی تھیں۔ وہ اس خیال سے زیادہ بوکھلاتے ہوتے تھے کہ انھیں بین امریکن اتر دیز سے سفر کرنا تھا۔ "یار میری کم نعت امریکن تو انگریزوں کی انگریزی کی بھی گردن مروڑ دیتے ہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ یہ آپس میں ایک دوسرے کی بات کیسے سمجھ جاتے ہیں؟" انھوں نے شکوہ کیا۔

"اچھی بھلی انگریزی بولتے ہیں" ہم نے کہا۔

بولے !

"خاک اچھی بولتے ہیں۔ ناک میں بولتے ہیں۔ ہر لفظ میں نون غنہ ضرور لگاتے ہیں اور لفظوں کو یوں لٹا دیتے ہیں جیسے استری کر دی ہو اور پھر وہاں تو اتر پڑیں بھی امریکن ہوں گی۔ سنا ہے مسافر بھی زیادہ تر یورپین اور امریکن ہوتے ہیں۔ یار میرا تو دم گھٹ جاتے گا۔"

ہم نے انھیں دلاس دیا اور تربیت کے پہلے سبق کے طور پر اپنے ساتھ بین امریکن کے دفتر لے گئے جہاں بیشتر عملہ پاکستانی تھا۔ انھوں نے وہاں بھی اُردو اور پنجابی بولنی شروع کر دی۔

وہاں جانے کی نوبت آ رہی تھی۔ لندن۔ روم۔ پیرس۔ جینیوا۔ فرینکفرٹ۔ بیروت۔ پہلے ہی سفر میں ان تمام شہروں کا دیدار ہونے والا تھا۔ ہمیں اس وقت تک یقین نہیں آیا جب تک ہم کراچی سے بین ایم کے ہوائی جہاز میں سوار ہو کر پرواز نہیں کر گئے۔ مگر اس سے پہلے یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہ سفر کس سلسلہ میں تھا؟ دو پاکستانی فلم ساز بیک وقت یورپ میں اپنی فلموں کی شوٹنگ کرنے جا رہے تھے اور اتفاق سے دونوں کے مصنف ہم تھے۔ فلم ساز راشد مختار کی فلم "میرے ہم سفر" کی فلم بندی لندن اور یورپ کے مختلف شہروں میں ہونے والی تھی جب کہ فلم ساز وادکار اعجاز درانی کی فلم "دوستی" کی شوٹنگ کے لیے لندن کو مرکز بنایا گیا تھا۔ "دوستی" ان پاکستانیوں کی کہانی ہے جو روپیہ کمانے کے شوق میں باہر جاتے ہیں مگر وہاں عام تصورات کے برعکس نہایت کھٹن حالات سے دوچار ہوتے ہیں جو لوگ وہاں خوش قسمتی سے دولت مند ہو بھی جاتے ہیں وہ مختلف ذہنی، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی اولاد مشرق اور مغرب کے درمیان ملتے ہو کر رہ جاتی ہے۔ مغرب والے انھیں مشرقی سمجھ کر ناپسند کرتے ہیں اور مشرق میں انھیں مغرب زدہ قرار دے کر مسترد کر دیا جاتا ہے اس اہم موضوع پر بنائی جانے والی اس فلم میں انگلستان میں رہنے والوں کی حقیقی زندگی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ تو ہم نے سُنی سنائی اور کچھ وہاں جا کر رہنے والوں کے تاثرات سے اخذ کیا اور کچھ کتابی معلومات کا سہارا لیا۔ لیکن وہاں کے طرز زندگی کو پیش کرنے کے لیے وہاں جا کر بذاتِ خود مشاہدہ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اسی مقصد سے ہم فلم یونٹ کے ساتھ جا رہے تھے۔

لیکن "دوستی" سے پہلے "میرے ہم سفر" کی فلم بندی کا آغاز ہونا تھا۔ کہاں ہونا تھا؟ یہ خدا بہتر جانتا تھا یا فلم ساز راشد مختار، ہدایت کار پرویز ملک اور عکاس سہیل ہاشمی مناسب جگہیں تلاش کرنے کے لیے ایک مہینے پہلے ہی رخصت ہو گئے تھے اور یورپ کے

ہمارے انکار پر انھوں نے بیس ڈالر کا نوٹ چلتے چلتے ہمارے کوٹ کے استر میں رکھ دیا اور بولے۔

”یہ بیس ڈالر لندن میں واپس لے لوں گا“
اس طرح ہم تین مسافر مبلغ ساٹھ روپے پاکستانی اور بیس ڈالر امریکی ساتھ لے کر یہ لمبا سفر کر رہے تھے۔ ڈالر کے نوٹ کی ہم نے ساتھیوں کو ہوا بھی نہیں گئے دی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہ وہ راستے میں اپنی فرمائشوں سے ناک میں دم کر دیں گے اور بیس ڈالر روم پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے۔

بین ایم کی فلائیٹ بے حد امریکن اور انتہائی مزیدار ثابت ہوئی۔ مسافر میٹر گرے تھے، ماحول انتہائی رومانی اور کیف آور تھا اور یارخاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا دیکھیں اور کیا نہ دیکھیں۔ خود ہمارا یہ بیرون ملک پہلا سفر تھا اور وہ بھی امریکی اتر لائن کے ذریعے۔ ہمارے دونوں ساتھی بالکل ہی اناڑی تھے۔ مونر نے تو اس سے پہلے ہوائی جہاز میں سفر کیا ہی نہیں تھا اور پہلی بار جہاز میں بیٹھا تھا اس لیے سخت بوکھلایا ہوا تھا۔ اکثر وہ اتر ہسٹس کو ”سسر“ کہہ کر مخاطب کرنے کی کوشش کرتا رہا جو ظاہر ہے اس نے نہیں سنا۔

یارخاں نے چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد لمبی تڑنگی امریکن اتر ہسٹس کے بارے میں اظہار پسندیدگی کرتے ہوئے اُردو اور پنجابی میں زور شور سے تبصرہ کیا بلکہ حالات اور موقع کے لحاظ سے کچھ شعر بھی پڑھے۔ اس کے بعد ان کی فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ”فراکات، مشروبات، سگریٹ، ماچس، پانی غرضیکہ انھیں ہر چیز کی ضرورت پڑ رہی تھی جو ہمارے توسط سے فضائی میزبان تک پہنچانی جاتی تھی۔ یارخاں کو جو چیز پسند آتی وہ فوراً کہتے کہ ”انگریزی میں“ انھیں ”تا دو۔ جب ہم ان کی بات نہ مانتے تو کہتے ”یار“ جلیس ہو گئے تا؟

”انگریزی بولو۔ ورنہ ”روانگی“ کیسے پیدا ہوگی“ ہم نے چپکے سے انھیں ٹوکا، کہنے لگے۔

”یار یہ تو پاکستانی لوگ ہیں۔ ان کے سامنے انگریزی بولوں گا تو غلطیاں نکالیں گے۔ امریکنوں کی تو سمجھ ہی میں نہیں آئے گا کہ کیا بول رہا ہوں۔ اس لیے جہاز میں جا کر انگریزی بولیں گے“
اس اثناء میں ایک خاتون نے ریٹرن ٹکٹ ہمارے سامنے رکھ دیا تھا۔ ہم پر ایک عجیب سرخوشی کا عالم طاری تھا اور کانوں میں اپنے استاد قاضی کی آواز گونج رہی تھی جو ہمیں دسویں جماعت میں پڑھا یا کرتے تھے۔ ہم نے ان سے کہا تھا۔
”قاضی جی۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ دنیا کا کونہ کونہ دیکھیں“
قاضی جی بولے۔

”میرے عزیز۔ تمھاری یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی۔ کیونکہ دنیا کے کونے نہیں ہوتے، دنیا گول ہے۔ البتہ تم گھوم پھر کر دنیا کی گولائیاں دیکھ سکتے ہو۔“

اور دنیا کی گولائیاں دیکھنے کے لیے ہم بین ایم کی فلائیٹ میں سوار ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بیرون ملک، خصوصاً یورپ کا سفر ہر کوئی نہیں کرتا تھا اور زرمبادلہ حاصل کرنا تو جوتے شیر لانے کے برابر تھا۔ ہمارے ہتھ کا زرمبادلہ فلم ساز راشد مختار صاحب کے پاس تھا اور ہم محض خالی ہاتھ سفر کر رہے تھے۔ ہر پاکستانی اپنے ساتھ بیس پاکستانی روپے لے جاسکتا تھا جو ہم نے اپنے پرس میں رکھ لیے تھے۔ ہم شریف اور ڈرپوک آدمی ہیں اس لیے غیر قانونی طور پر زرمبادلہ ساتھ لے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ مگر اداکارہ شبنم کے شوہر روبن گھوش نے ہمیں نصیحت کی تھی کہ دقت بے دقت کے لیے تھوڑے بہت ڈالر اپنے ساتھ ضرور رکھ لینا ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گے

مگر پہلا مرحلہ اس وقت پیش آیا جب ناشتے میں فرائیڈ انڈوں کے ساتھ ہمیں انتہائی خوشنما گوشت کے پارچے پیش کیے گئے۔ چھری کانٹے کی مدد سے کاٹا تو اندر سے انتہائی نفیس سُرخ مائل گوشت نمودار ہوا۔ ہم نے کہا۔
 ”خاں صاحب۔ گوشت کا رنگ دیکھ رہے ہو؟“

”مسکرا کر بولے۔“

”ابھی کیا بات ہے امریکیوں کی۔ کتنا عمدہ گوشت ہے۔ ایک ہمارے ملک کا گوشت ہوتا ہے۔“ انھوں نے گلابی گوشت کو اپنے کانٹے میں پردتے ہوئے داد طلب نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔

”مگر یہ اتنا سُرخ کیوں ہے؟“

”یار تم نے دیکھا نہیں۔ امریکن کتنے سُرخ سفید ہوتے ہیں۔ اب ذرا سامنے جلنے والی اتر ہوٹس کی پنڈلیاں دیکھو۔ ہے کوئی مقابلہ؟“

”یار خاں؟“

”ہم نے خوفزدہ ہو کر کہا۔“

”ہمارا خیال ہے یہ حرام گوشت ہے۔ پہلے اس کی تصدیق کرنی چاہیے۔“

یہ کہہ کر ہم نے برابر سے موجِ مصر کی مانند گزرتی ہوئی اتر ہوٹس کو اپنی طرف متوجہ کیا اور پوچھا۔

”سینے۔ کیا یہ ہیمل ہے؟“

”آف کورس۔“

اُس نے مسکراہٹ کی بجلیاں گراتے ہوئے جواب دیا اور تیزی سے آگے نکل

گئی۔

خان صاحب کا کانٹا نصف راستے میں معلق رہ گیا۔ پھر انھوں نے لاجول پڑھتے

ہوتے گوشت کے پارچے کو واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ منور نے بھی ان کی تقلید کی۔ ہم نے اتر ہوٹس کو مطلع کیا کہ ہم مسلمان ہیں اور سور کا گوشت حرام سمجھتے ہیں۔ ہمارے لیے دوسرا ناشتہ لاؤ۔ مزید زور دینے کے لیے خاں صاحب نے بھی انگریزی کی ٹانگ توڑ فی شروع کر دی۔

”مسلم یونو؟ ہیمل از۔“

وہ حرام کے لیے مناسب انگریزی لفظ تلاش کرنے لگے۔

”یار وہ انگریزی میں کیا ہوتا ہے ”حرام“؟“

ہوٹس جلدی میں تھی۔ اس نے صرف مسکراتے پر اکتفا کیا اور چلی گئی مگر واپسی میں اس نے ہمیں سرزنش کی کہ آپ نے یہ معلومات ٹکٹ حاصل کرتے ہوئے کیوں نہیں لکھوائی تھیں۔ ہمارے پاس تو ہدایات کے مطابق ناشتہ ہوتا ہے۔ اب آپ انتظار کیجیے۔ میں کوئی بندوبست کرتی ہوں۔

بندوبست کرتے کرتے اُس نے اتنی دیر کر دی کہ ہمارے آس پاس والوں نے اپنا ناشتہ ختم کر کے ڈکاربز لینی شروع کر دیں۔ خدا خدا کر کے اس کی من موہنی صورت دوبارہ دکھائی دی۔ اس نے ایک باسکٹ اور ایک ٹرے ہمارے سامنے لا کر رکھ دی جو انواع و اقسام کے بسکٹوں، پیئر، ٹوسٹ، کھٹن، پھلوں وغیرہ سے بھری ہوئی تھی۔ معذرت کے انداز میں بولی۔

”معاف کرنا۔ جو دالِ ولیہ متیسر ہوا وہ حاضر ہے۔ آئندہ کبھی ہدایات کے بغیر

سفر نہ کرنا۔ یو مسلم!“

اور غائب ہو گئی۔ ناشتے کا سامان اتنا زیادہ تھا کہ خان صاحب نے بچا کچا اپنے بیگ میں بٹھونس لیا اور ہمارے ٹوکے پر بولے

”یار آخر ہم نے بھی ٹکٹ خریدا ہے۔ یہ سامان ضرورت کے وقت کام آئے

میں چلے گئے۔ ایک مرجیں مسکراتی ہوتی ہماری طرف آئیں اور انگریزی میں پوچھنے لگیں۔ "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" کاش ہم ان سے کوئی خدمت کرنے کے قابل ہوتے۔ پھر بھی چاہتے کے ایک کپ کی قیمت دریافت کر لی جو انھوں نے ڈالروں میں بتائی۔ ہم نے لمبا جت سے پوچھا۔

"پاکستانی کرنسی چلے گی؟"

انھوں نے ناک چڑھا کر جواب دیا۔

"سواری۔ اونلی امریکن ڈالر۔"

ہم لوٹ آتے اور یارخان کو مشن کی ناکامی سے آگاہ کر دیا۔ وہ بہت ناراض ہوتے۔ عربوں کو بہت دیر تک برا بھلا کہتے رہے کہ دیکھتے۔ اپنے دوست اسلامی ملک کی کرنسی کی کچھ قدر ہی نہیں کرتے۔ یہ کہاں کا اخلاق اور بھائی چارہ ہے؟ ہم دوبارہ اترپورٹ کی رونقیں دیکھنے میں مصروف ہو چکے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ تھوڑی دیر بعد چلتے داتے کہ بھول کر نظارہ بازی میں ایسے عمو ہوتے کہ اپنے ساتھیوں کی جانب سے ملحق بے خبر ہو گئے۔ اس اثنا۔ میں یارخان ایک بک سٹال پر پہنچ کر خالص دیسی عادات کے مطابق میگزین اور کتابیں دیکھنے بلکہ پڑھنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں وہ سب میگزین اور کتابیں نظر آئیں جن کا تذکرہ بھی ہمارے ملک میں ممنوع تھا۔ فوراً بھاگے بھاگے ہمارے پاس آتے اور پھولی ہوتی سانسوں سے بتایا کہ یار۔ یہ لوگ تو بہت بے شرم ہو گئے ہیں۔ کیسی کیسی واہیات کتابیں اور میگزین کھلے عام رکھ چھوڑے ہیں۔ یہ اطلاع دے کر وہ دوبارہ بک سٹال پر پہنچ گئے۔ مگر افسوس کہ میگزینوں کے صفحے اُلٹ کر نہیں دیکھ سکے کیونکہ دوکاندار نے ان جیسے شوقین اور مفت خوردگاہوں سے بچانے کے لیے انھیں پلاسٹک کے بند کور میں رکھ چھوڑا تھا۔ مگر "بیہودہ کتابیں" البتہ کھلی رکھی تھیں۔ وہ کھڑے کھڑے دو تین کتابیں تو

گا۔ وہ کون سا ہم سے حساب لے گی؟ بعد میں ان کی ہر بات سولہ آنے درست نکلی۔ کیونکہ جب ہم نے راستے میں بیروت میں ساڑھے چھ گھنٹے قیام کیا تو یارخان کے سنبھال کر رکھے ہوئے بسکٹ، پنیر اور مکھن بہت کام آیا۔

بیروت کی رونقیں اُس زمانے میں پورے عروج پر تھیں۔ ہمارے لیے تو یوں بھی ہر چیز نئی اور انوکھی تھی۔ پہلی بار پاکستان سے باہر قدم رکھا تھا اور ہر بین الاقوامی معیار کی چیز ہمیں حیرت میں ڈال رہی تھی۔ چنانچہ یہی واقعہ بیروت میں بھی رونما ہوا۔ کراچی اور بیروت کے اترپورٹ کا بھلا کیا مقابلہ؟ وہ انتہائی صاف شفاف، خوبصورت بے حد ماڈرن۔ ہر چیز مغربی ساخت اور وضع کی۔ عمارت بے حد عالیشان اور کشادہ دنیا بھر کے مسافروں کی ریل پیل، چل پیل ایسی کہ ہمارا جی چاہا وہیں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہیں۔ محلے کے لوگ بہت اخلاق اور مذہب۔ یہ ہمارا کسی بیرونی اترپورٹ کو دیکھنے کا پہلا تجربہ تھا اور وہاں اتنی بڑی تعداد میں محلے اور مسافروں میں خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ ان کی صورت شکل، ناک، نقشہ، عادات و اطوار، انداز گفتگو، نشست و برخاست کا طریقہ، سبھی کچھ ہمارے لیے نیا تھا۔ ان کی دکانیں مسکراہٹ اور چمکتی سیاہ آنکھیں، ڈھکتے ہوئے سُرخ و سفید چہرے اور پھر اس پر مستزاد مغربی لباس اور طور طریقے۔ ہم تینوں تو نہیں دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے آئینہ خانے میں پیٹ ڈچلے آتے ہیں۔

بیروت میں ہمارا قیام ساڑھے چھ گھنٹے کا تھا۔ کچھ دیر تو ہم ادھر ادھر ٹہکتے اور نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہے مگر پھر جھوک نے ستایا۔ یارخان کو چاہتے کی طلب بے تاب کئے دے رہی تھی۔ کرنسی ہمارے پاس تھی نہیں کیونکہ پچاس ڈالر کا نوٹ ہم نے بہت احتیاط سے چھپا رکھا تھا اور اپنے ساتھیوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ مگر جب چاہتے کی خواہش نے بہت ستایا تو ہم ٹہکتے ہوئے ریسٹورینٹ

ہر لحاظ سے پیرس سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ جال کی رعنائیاں، عیش و طرب کی آسانیاں شراب و شباب کی شوغیاں اور فراوانیاں، نائٹ کلبوں کی رونقیں، قمار خانوں کی محفیں، ہوٹلوں، ساحلوں اور ریسٹورانوں کی دلکشی، غرضیکہ یہ شہر مرکزِ رعنائی تھا اور یوں لگتا تھا جیسے دنیا بھر کا حسن و جمال سمٹ کر اس چھوٹے سے شہر کے دامن میں سما گیا ہے، قدرت اور انسان کی صنایعوں کا مرقع، اس کا ہر انداز دیوانہ کر دینے والا تھا۔ پھر یہ دیکھا کہ سو سو گنگ پُول میں جُل پریاں محو غسل ہیں اور کنارے پر بارش، جُبہ پوش، نورانی چہروں والے بزرگ فروکش ہیں۔ ہاتھ میں تیس، سامنے شراب کا گلاس، منہ ہی منہ میں خدا جلنے کیا پڑھتے رہتے تھے لیکن نگاہیں کہیں اور مصروفِ خرام ہوا کرتی تھیں۔

خیر، یہ توجملہ معترضہ تھا۔ تذکرہ تھا بیروت اتیر پورٹ کا۔ ہماری چلتے کی خواہش میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا مگر اس کے حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم بھی گھوم پھر کر تھک گئے تھے اور ایک جانب آرام دہ صوفوں پر نیم دراز شفاف شیشوں کے پیچھے بیروت اتیر پورٹ کے آس پاس کی پہاڑیاں دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک سُرخ و سفید، خوش جال سیکورٹی گارڈ ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ مُسکرا کر پوچھا "ہندی؟" ہم نے پُر زور تردید کی اور بتایا کہ ہم پاکستانی ہیں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ نہایت گرمجوش سے ہم سب سے معاف کیا اور ~~معاذ اللہ~~ میں پاکستانیوں کی سرفروشی اور بہادری کے واقعات کی بہت تعریف کی۔ کافی دیر تک پاکستان کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لاہور پاکستان میں ہے۔ وہ اسے ہندوستان کا شہر سمجھ رہا تھا۔ یارخان اُس کی لاعلمی پر بہت برہم ہوتے، بولے۔

"یار چھوڑو۔ اس سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ اسے تو ہمارے مُلک کا جغرافیہ بھی معلوم نہیں ہے۔"

پڑھ گئے۔ وہ اس طرح کہ ہر کتاب کے چند صفحے پڑھتے اور پھر مارے ہوئے کے دوسری کتاب کا مطالعہ شروع کر دیتے۔ دو کا نذر ایک طرحدار خاتون تھیں۔ کچھ دیر تو انھوں نے صبر کیا مگر پیران سے رہا نہ کیا اور وہ یارخان سے مخاطب ہوئیں۔

"ایکسیکوزنی۔ کیا آپ یہ کتاب خریدیں گے؟"

میر بولکھلا کر بولے۔

"جی۔ ابھی تو درق گردانی کر رہا ہوں۔"

انھوں نے دستِ خانی بڑھا کر کتاب ان کے ہاتھ سے لے لی اور بولیں۔

"معاف کیجئے۔ یہ کتابیں صرف خریدنے کے لیے ہیں۔ درق گردانی کے لیے نہیں۔"

یارخان ہمارے پاس واپس آتے تو غصے کے مارے ان کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ کافی دیر تک عربوں کی اخلاقی پستی کا ماتم کرتے رہے۔

"اس قدر فضول کتابیں اور یوں کھلے عام رکھ پھوڑی ہیں۔ عودیں۔ بچے بڑے بوڑھے سبھی دیکھ رہے ہیں۔ یار ان کو ذرا بھی شرم نہیں ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک جوان عورت یہ غرافات فروخت کر رہی ہے۔ کتنے شرم کا مقام ہے۔ ان لوگوں پر ضرور کوئی عذاب نازل ہوگا۔"

عذاب تو کچھ عرصے بعد واقعی بیروت پر نازل ہوا۔ مگر وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ یارخان کی بددعا کی بدولت تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ مگر انھوں نے "آثارِ قیامت" صاف طور پر دیکھ لیے تھے۔ اس کے بعد واپسی میں ہم بیروت میں مقیم ہوتے اور بقول یارخان "قیامت کی نشانیاں" دیکھیں۔ بیروت اُس زمانے میں مشرق کا پیرس کہلاتا تھا۔ واپسی میں ہم کیونکہ پیرس بھی دیکھ آتے تھے اس لیے اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ محض عربوں کی کسبِ نفسی تھی یا پیرس کی گڈول سے فائدہ اٹھانے کی خواہش، ورنہ بیروت

”مسلم کھانے“ کے نام کی کوئی چیز ہوائی جہازوں میں دستیاب نہیں تھی۔ البتہ یہودیوں کے لیے ”کوشنریل“ ضرور موجود ہوتا تھا۔ اسی سفر میں ہمیں پہلی بار یہ بات معلوم ہوتی کہ یہودی کسی قیمت پر بھی سور کے گوشت کو چھونا پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ دُنیا بھر میں ان کے لیے ”کوشنریل“ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ کھانا نہ صرف خنزیر کے گوشت سے محفوظ ہوتا ہے بلکہ باقاعدہ ذبیحہ کا گوشت ہوتا ہے۔ اور ہر کھانے پر یہودیوں کے برقی (پادری) کی ہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔ اللہ اللہ کیا ٹھٹھا ہیں؟ ہم نے سوچا۔ مگر پھر رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ جب عربوں اور مسلمانوں نے سیر و سیاحت اور دُنیا کو زیر و زبر کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو ”مسلم میل“ بھی دستیاب ہونے لگا۔ بلکہ کچھ سال بعد تو ہم نے انگلستان کے بڑے بڑے سٹوروں اور ریٹورانوں میں عربی میں ہدایات اور اشتہار بھی لکھے دیکھ لیے۔ دراصل عربوں کی دولت مندی کے آگے سبھی نے آنکھیں پجھادی ہیں۔ کچھ عرصے بعد یہی اہتمام جاپانیوں کے سلسلے میں بھی دیکھنے میں آیا۔ جب سے جاپانیوں کے پاس دولت کی ریل پیل ہوئی ہے اور انھوں نے ڈالر ٹکنے شروع کیے ہیں۔ یورپ کے لوگ امریکی دولت مندوں کی کمائیاں بھول گئے ہیں اور جاپانیوں کی آؤ بھگت میں لگ گئے ہیں۔ دراصل یہ تو سودا گروں اور دوکانداروں کی اقوام ہیں۔ خاص طور پر انگریز۔ انھیں تو میں منافع کمانے سے غرض ہے۔ خواہ وہ عربوں کی خدمت کر کے حاصل ہو یا جاپانیوں کی چابلو سی سے ملے۔

بیروت سے ایک جامع زریب عرب نوجوان بھی ہمارا ہم سفر ہوا۔ وہ لندن جا رہا تھا جب کہ ہماری منزل روم تھی۔ نام اس نے طارق بتایا۔ تھوڑی دیر بعد ہم آپس میں گھل مل گئے۔ کچھ دیر بعد جب اس نے ایئر ہوٹس سے شراب طلب کی تو یار خاں نے ہمیں گہنی ماری اور سرگوشی میں بولے۔

”یار یہ کیسا مسلمان ہے، کم بخت شراب پیتے گا۔ اور وہ بھی دن دہارے؟ اگھلے

ہم نے تسلی دی۔ ”خاں صاحب۔ لگتا ہے جغرافیے اور تاریخ میں کمزور ہے۔ بے چارہ۔“

”ویسے تو خوب ہٹا کٹی اور صحت مند ہے“ وہ جَل کر بولے۔

سیکورٹی گارڈ اتنی دیر میں عربی نا انگریزی میں ہمیں بیروت کے بارے میں بہت کچھ بتا چکا تھا۔ یکایک کچھ سوچ کر یار خاں کا چہرہ دھکنے لگا۔ بولے۔

”یار یہ تو اب ہمارا بہت دوست بن گیا ہے نا۔ یہ ہمیں ضرور چلنے کی دعوت دے گا۔“

مگر اس خدا کے بندے نے تو کسی بھی قسم کی خاطر تواضع کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ کافی دیر تک ہمارا دماغ کھانے کے بعد وہ ”اللہ حافظ“ کہہ کر رخصت ہو گیا اور یار خاں کے لیے ایک اور موضوع گفتگو چھوڑ گیا۔ خدا خدا کر کے ہماری فلائیٹ کا اعلان ہوا اور ہم نے ہوائی جہاز میں سوار ہوتے ہی چلنے کی فرمائش کر دی۔ خاں صاحب نے پیچھے کچھ بسکٹ وغیرہ نکالے اور ایئر ہوٹس کی نظر بچا کر ہمیں پیش کیے۔ کہنے لگے۔

”منہ چھپا کر کھانا۔“

”مگر کیوں؟ ہم نے پوچھا۔“

”کوئی چوری ہے؟“

کہنے لگے۔ ”یار پتہ نہیں کیا سوچے گی۔ میں خوبصورت لڑکیوں کے سامنے

شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔“

مگر اُس غریب کے پاس سوچنا تو کیا ہماری طرف دیکھنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد کھانا پیش کیا گیا اور اتفاق سے ہمیں ”کوشرفوڈ“ مل گیا۔ اُس وقت تک مسلمانوں نے اتنی زیادہ تصاد میں سفر کرنے کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا اس لیے

میں مسافرت کے عالم میں ہوں ورنہ تمہارا پیٹ پھاڑ دیتا۔“
مگر خیریت یہ ہوتی کہ انھوں نے یہ فقرہ بھی پنجابی زبان میں کہا تھا۔ کوئی اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ مگر ان کے لب و لہجے اور غصہ و غضب نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ہم نے زیر لب کہا۔

”خدا کے لیے ہوش میں رہو۔ کیوں اپنی اور ہماری بے عزتی کرانے پر
ٹٹے ہوتے ہو۔“

اتنے میں اتر ہوٹس بھی بوکھلاتی ہوتی ہمارے پاس آگئی تھی اور اپنی غزال جیسی
آنکھوں سے یار خاں کو دیکھ رہی تھی جو ہماری بات سننے کے بعد سیٹ پر نیم دراز
ہو کر لمبی لمبی سانس لے رہے تھے۔ بعد میں انھوں نے بتایا کہ یہ کوئی یوگا کی مشق ہے
جس سے انسان کے لیے غصے پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔

اتر ہوٹس نے امریکی لہجے میں پوچھا۔

”کوئی گڑ بڑ ہے کیا؟ ڈاکٹر کو بلاؤں؟“

ہم نے کہا۔

”فکر کی بات نہیں ہے۔ بس ذرا بلڈ پریشر کے مریض ہیں۔ ہوائی جہاز میں

دیر تک سفر کرنے سے ان کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔“

وہ دوڑی دوڑی گئی اور کورور میں پانی کے گلاس میں ڈال کر لے آئی۔ ہمارے

منع کرتے کرتے اس نے یار خاں کو آہستگی سے پکارا اور انھوں نے آنکھیں کھولیں تو بہت

لگاوٹ سے بولی۔

”لیں۔ یہ پی لیجئے۔“

یار خاں ایک دم اٹھن شن ہو گئے۔ پوچھنے لگے۔

”شراب ہے؟“

بندوں؟“ غالباً زیادہ اعتراض انھیں دن دھاڑے اور کھلے بندوں پینے پر تھا۔ ہم
نے طارق سے پوچھا۔

”تمہارے نام سے تو لگتا ہے کہ تم مسلمان ہو۔“

مگر جوشی سے بولا۔

”الحمد للہ۔“

ہم نے حیران ہو کر سوال کیا۔

”مگر یہ شراب...؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ایک گھونٹ بھرا اور کہنے لگا۔

”تھوڑی بہت پینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم جانتے نہیں۔ اسلام میں

شراب حرام نہیں ہے، نشہ حرام ہے۔ اور میں کبھی مدہوش نہیں ہوتا۔“

لیجئے۔ قصہ ہی ختم ہو گیا۔ یار خاں تو آگ بگولا ہو گئے۔ پنجابی میں کہنے لگے۔

”اے ہٹا دیجئے میرے سامنے سے۔ ورنہ ایمان سے مار بیٹھوں گا۔“

ہم نے انھیں سمجھایا۔

”زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بین ایم کا ہوائی جہاز

ہے۔ آپ کا ڈرائنگ روم یا بیٹھک نہیں ہے اور وہ بھی مسافر ہے۔“

کہنے لگے۔

”یہ تو اسلام میں بھی مداخلت کر رہا ہے۔ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟“

طارق نے مسکرا کر یار خاں کو دیکھا اور ایک آنکھ میچ کر کہنے لگا۔

”پیو گے؟ ایک گھونٹ تو لے کر دیکھو، چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔“

یار خاں دھاڑ کر بولے۔

”بکواس بند کرو۔ شکر کرو کہ تم اس وقت ہوائی جہاز میں بیٹھے ہو اور

سفر کرتی تو تمھاری بھابھی بن جاتی۔ دیکھا نہیں۔ کتنے پیار سے دیکھ رہی تھی؟ ویسے یار یہ گوری چڑی والی لڑکیاں پیار دیار کی قابل تو نہیں ہوتیں۔ مگر جب کسی سے پیار کرتی ہیں تو پیار میں جان دے دیتی ہیں۔
”جیسے بھالی محبوں“ مشور نے لقمہ دیا۔

”جاہل ہیں آپ۔ رومیو جولیٹ کتے ہوتے آپ کو موت آتی ہے؟“
یار خاں جل کر بولے۔

بہر حال۔ اس گننام حسینہ کی یاد پر رے سفر کے دوران انھیں بے طرح ساقی ہی۔ بار بار پچھتاتے تھے، ہاتے۔ میں اس کا نام اور پتہ ہی پوچھ لیتا تو کیا تھا؟
”کم از کم فون نمبر ہی لے لیا ہوتا“ ہم نے مشورہ دیا۔

”فون والی بات غلط ہے۔“

”کیوں؟“ ہم نے پوچھا۔

”یار فون کا خرچہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور تمہیں تو پتہ ہے کہ محبت کرنے والے کبھی مختصر بات نہیں کرتے۔“



اس کی سادگی ملاحظہ ہو۔ پوچھنے لگی۔

”شراب کی ضرورت ہے تو وہ لے آؤں!“

یار خاں نے ”لا حول ولا قوۃ“ کا زور دار نعرہ مارا اور وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ انھوں نے دوبارہ آنکھیں بند کر کے لمبی لمبی سانسیں لیتی شروع کر دیں۔
”اب تو ڈاکٹر کو بلانا ہی پڑے گا۔“ ایر ہوٹس نے کہا۔

طابق نے فوراً پیش کش کر دی۔

”ڈاکٹر ڈاکٹر کو چھوڑیے۔ دو گھونٹ پلا دیجئے۔ پھلے چنگے ہو جائیں گے۔“

خیریت یہ گزری کہ یار خاں اس وقت لمبی لمبی سانسیں لینے میں مصروف تھے درنہ واقعی فساد برپا ہو جاتا۔ مگر اس ڈر لے کا فائدہ یہ ہوا کہ یار خاں کی ”بیاری“ کے پش نظر ہوائی جہاز کے مسافر اور عملہ سمیت ہر کوئی انھیں سپیشل ٹریٹمنٹ دینے لگا۔ ایر ہوٹس گھڑی گھڑی ان سے پوچھتی۔

”اور کچھ چاہیے؟“

ہوائی جہاز کا کیپٹن بطور خاص انھیں ”ہیلو“ کہنے آیا اور سگریٹ کی ایک ڈبیہ دی۔ آس پاس کے لوگ بھی انھیں ہمدردی اور محبت سے دیکھتے رہے۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھی ہوتی فرنگی حسینہ بار بار مڑ کر انھیں دیکھتی اور حوصلہ افزائی کے لیے مسکراتی۔
یار خاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جب ہم روم کے ایر پورٹ پر اترنے لگے اور سامنے والی حسینہ نے انھیں مسکرا کر خدا حافظ کہتے ہوئے محبت بھرے انداز میں ان سے ہاتھ بھی ملایا تو یار خاں کافی دیر اس کا ہاتھ تھامے کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ پیچھے والے مسافروں نے انھیں دھکیلنا شروع کر دیا۔ دل پر پتھر رکھ کر وہ ہوائی جہاز سے تو نکل آئے مگر بار بار کہہ رہے تھے۔

”یار۔ اُسے سچ مچ مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ اگر لندن تک ہمارے ساتھ

کی خدمات حاصل نہ کرنا۔ یورپ میں سب لوگ اپنے کام خود ہی کرتے ہیں۔ اور پھر لوڈر بہت ہنگے ہوتے ہیں۔

”مگر یار میں سامان کا کیا کروں؟“ انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔

ہم نے کہا۔

”بس اس کونے میں کھڑے ہو جاؤ۔ دیکھو یہاں سے حرکت نہ کرنا۔ ہم

ان لوگوں کو تلاش کر کے یہیں آجائیں گے۔“

پھر ایئرپورٹ کی وسعت اور ہنگامہ خیزی کے پیش نظر ہم نے وہ مقام بھی یاد کر لیا جہاں خاں صاحب اور منٹور کو چھوڑا تھا۔ اب ہمیں راشد صاحب کی تلاش ہوتی ایک سرے سے دوسرے سرے تک سارا ایئرپورٹ چھان مارا۔ اوپر نیچے ہر جگہ دیکھ لیا یہاں تک کہ باہر ٹیکسی سٹینڈ تک ہو آئے مگر ان دونوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اب تو ہم واقعی پریشان ہو گئے۔ پی۔ آئی۔ اے کا کاذب تلاش کر کے وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کی کوئی فلائیٹ نہیں آئی اس لیے بند ہے۔ خدایا۔ کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ ایک اجنبی ملک، میزبانوں کا کوئی پتہ نشان نہیں۔ جیب میں پیسہ نہیں اور روم ہالے بے بالکل انجانا شہر۔ کچھ دیر ادھر ادھر پریشانی کے عالم میں گھومتے رہے جب یقین ہو گیا کہ ہمیں لینے کوئی نہیں آیا ہے تو مایوس ہو کر یار خاں کے پاس گئے۔ گھبراہٹ کے عالم میں ہم وہ جگہ بھول گئے جہاں انھیں چھوڑ کر آ گئے تھے۔ بوکھلاتے بوکھلاتے چاروں طرف پھرتے رہے۔ آخر یار خاں نظر آ گئے۔ وہ ہوائی جہاز کے کپتان کے پیش کیے ہوئے سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور نظریں ارد گرد کا طواف کر رہی تھیں۔ ہمیں انھوں نے دیکھا ہی نہیں۔ ظاہر ہے دیکھنے کے لیے اور بہت کچھ تھا۔ ہم پران کی کیا نظر پڑتی۔ ہم نے انھیں باقاعدہ جھنجھوڑا تو چونک کر کھڑے ہو گئے۔

”چلو، چلیں؟“

رُوم

روم کا ایئرپورٹ بیروت سے بھی زیادہ پُرشکوہ اور بارونق تھا۔ پہل پہل اور رونق بھی زیادہ تھی۔ ہم درجہ بدرجہ جدید تہذیب و تمدن کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ کسٹم کے لوگ انتہائی خوش اخلاق اور ہنس مکھ نکلے۔ انھوں نے ہمارے سامان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ بعد میں ہم یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی گئے اور معلوم ہوا کہ ان دنوں کسٹم کی چانگ برائے نام ہی ہوا کرتی تھی جب کہ ہمارے کراچی ایئرپورٹ پر معاملہ بالکل برعکس تھا۔ اور کسٹم کی سختیاں۔ تو بہ۔ تو بہ۔ خیر اس کا دقت آنے پر تذکرہ ہوگا۔ پہلے روم کی داستان سنئے۔

ایئرکیشن سے باہر نکل کر انتہائی وسیع لائن میں پہنچے تو ہماری آنکھیں بھٹی کی بھٹی رہ گئیں۔ بھٹی واہ۔ ہم تو بیروت کے ایئرپورٹ کو دیکھ کر ہی حیران رہ گئے تھے۔ یہ تو پھر روم تھا۔ چاروں طرف آئینہ گری۔ اور فرش اس قدر خوبصورت کہ جی چاہتا تھا بس یہیں لیٹ جاؤ۔ اس پاس خوش حال اور خوبصورت لوگوں کی آمد و رفت نے ہمیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اب سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں فلم ساز راشد مختار اور ہاشم کار پرویز ملک کو تلاش کرنا تھا جو روم میں ہمارے منتظر تھے۔ ہم نے سامان یار خاں کی تحویل میں دیا اور انھیں خاص طور پر ہدایت کی کہ دیکھو سامان اٹھانے کے لیے لوڈر

”کہاں چلیں، ان میں سے تو کوئی موجود نہیں ہے۔“

”ارے یار مذاق مت کر د۔“

”مذاق کی بات نہیں ہے۔ ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔“

خاں صاحب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ بولے۔

”اب کیا ہوگا۔ ہمارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔“

ہم نے انھیں تسلی دی اور کہا۔

”یار گھبراتے کیوں ہو۔ اللہ مالک ہے۔ تم دونوں اپنے اپنے بیس روپے

نکالو تاکہ میں اطالوی کرنسی میں تبدیل کراؤں۔“

کہنے لگے۔

”بیس روپے سہ کیا ہوگا۔ لگتا ہے ہمیں تو روم میں بھیک مانگنی پڑے

گی۔“

بہر حال۔ انھوں نے روپے ہمارے حوالے کیے اور ہم نے کرنسی ایکسچینج کی

کھڑکی کا رخ کیا اور اپنے احتیاط سے بچا کر رکھے ہوئے بیس ڈالر اور مبلغ ساٹھ روپے

اس حسین و جمیل خاتون کے حوالے کر دیتے جو کھڑکی میں بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ انھوں

نے حساب کتاب کرنے کے بعد پانچ ہزار سات سو لیرا ہمارے سامنے رکھ دیتے۔ سر سے

پیر تک جائزہ لیا اور مسکرا کر انگریزی میں پوچھنے لگیں۔

”آپ انڈین ہیں؟“

ہم نے بھی مسکرا کر انھیں دیکھا اور انکار میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”آپ جرمن ہیں؟“

انھوں نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا۔

”یہ آپ کو کیسے خیال ہوا؟ دیکھتے نہیں میں روم کے ایئر پورٹ پر بیٹھی ہوں۔“

ہم نے کہا۔

”آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ ہم نے ابھی پاکستانی کرنسی تبدیل کرائی ہے۔“

اس لیے ظاہر ہے کہ پاکستانی ہیں۔“

”اودہ۔ معاف کرنا۔ دراصل دیکھنے میں آپ اور انڈین ایک جیسے لگتے

ہیں۔“

ہم نے کہا۔

”جس طرح آپ اور جرمن ایک جیسے لگتے ہیں۔“

یہ کہہ کر ہم انھیں حیران چھوڑ کر یار خاں کی طرف گئے۔ پانچ ہزار سات سو لیرا

انتہائی قلیل رقم تھی۔ جو ہم تین افراد کے لیے روم جیسے مہنگے شہر میں شاید دو وقت کے

کھانے کے لیے بھی کافی نہیں تھی۔ پھر قیام اور طعام کا مرحلہ تھا۔ کسی سستے سے معقول ہوٹل

کو تلاش کر کے وہاں تک پہنچنے کا مسئلہ تھا۔ اُدھر ہمارے میزبانوں کا دور دورہ ہم

پتہ نہیں تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ان سے رابطہ کیوں کر قائم کیا جلتے؟

سامنے نظر پڑی تو دیکھا کہ یار خاں تمام سامان ایک ٹرائی پر رکھوائے کھڑے

ہیں اور اطالوی پورٹر دونوں ہاتھ ہلا کر اور شانے اُچکا کر نہ جانے ان سے کیا کہ

رہا ہے۔ ہمیں دیکھا تو خوش ہو کر ہماری طرف بڑھے۔

”سنو یار۔ میں نے یہ قلی کر لیا ہے۔ بہت سستا مل گیا ہے؟“

ہم نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

”کتنا سستا؟“

کہنے لگے۔

”یہ تو میں نے پوچھا نہیں۔ پتہ نہیں کیا کہہ رہا ہے۔ کہہ رہا تھا بہت سستا

لوڈر ہوں۔“

ہاٹی ہو جاتے۔ ہم نے ترس کھا کر کہا۔

”خیر، اب کیا ہو سکتا ہے۔ مگر آئندہ کے لیے کان کھول کر سن لیجئے۔ اگر

میری بات نہ مانی تو میں دونوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

یار خاں بولے۔

”یار سنو۔ اس قلی کو چھوڑ دیتے ہیں۔“

ہم نے کہا۔

”اب ایسا ممکن نہیں ہے۔ خیر۔ چلو۔“

ہمیں یہ امید تھی کہ شاید راشد مختار یا پرویز ملک میں سے کسی کی صورت نظر آجائے

مگر بے سود۔ بیرونی لابی میں ہوٹل والوں کے نمائندوں نے ہمیں گھیر لیا اور وہ چائیں چائیں

کی کہ ہم گھبرا گئے۔ ایک خوبصورت لڑکی بھی ہمیں اپنے ہوٹل چلنے کا مشورہ دے رہی

تھی۔ یار خاں کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے اس کے ہوٹل چلتے ہیں۔“

ہم نے مذاکرات شروع کیے تو پتہ چلا کہ بہت ہنگامہ ہوٹل ہے اور روم کے دوسرے

کنارے پر واقع ہے۔ بہت سے لوگوں سے بچ کر بالآخر ہم نے ایک نوجوان کو

پسند کیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ہوٹل ریلوے سٹیشن کے نزدیک ہے اور بہت سستا ہے۔

تین مہمانوں کے لیے صرف دس ڈالر روزانہ۔ اب اس سے سستا ہوٹل روم میں اور کیا ہو

سکتا تھا؟ ہم نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس نے فوراً ہمارا سامان ایک ٹیکسی میں

رکھوایا جس کا کرایہ ڈھائی ہزار لیرا طے پایا۔ یار خاں ٹیکسی میں تو بیٹھ گئے مگر بار بار

پوچھ رہے تھے۔

”یہ اتنے بہت سے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ خدا کا واسطہ۔ کہیں گروڈی

نہ رکھو دنیا۔“

ہم نے لوڈر سے پوچھا۔

”سامنے ٹیکسی تک کیا لو گے؟“

بولے۔

”ساتھ سو لیرا۔“

یار خاں نے بھی سن لیا تھا۔ ان پر تو قریب قریب غشی کا عالم عاری ہونے لگا۔

ہم نے کہا۔

”سن لیا آپ نے۔ یہ سات سو لیرا لے گا۔ وہ سامنے ٹیکسی تک جانے کا

معاوضہ۔ جانتے ہو سات سو لیرا کتنے ہوتے ہیں؟“

وہ سہم کر بولے۔

”نہیں تو۔ مگر یار ایمان سے مجھے ...“

ہم نے کہا۔

”آپ کو پتہ نہیں کہ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ لگتا ہے یہیں ایئر پورٹ

پر یہ گروڈی رکھ لیں گے۔ اور ہم قلیوں میں بھرتی ہو کر گزارہ کریں گے۔“

منور بھی پریشان تھا۔ کہنے لگا۔

”صاحب میں نے تو ان سے کہا تھا مگر یہ بولے قلی کتنے پیسے لے لے گا۔

آرام سے سامان تو چلا جاتے گا۔“

ہم نے کہا۔

”یہ پاکستان کا قلی نہیں ہے۔ یہ روم کا قلی ہے۔ اس کو سات سو لیرا دے

کر ہم خود کیا کھاتیں گے؟“

در اصل خاں صاحب کو لیرا کی کم قیمت کا اندازہ ہی نہیں تھا اس لیے سات سو لیرا

سن کر گھبرا گئے تھے۔ ان کا چہرہ سفید ہو گیا تھا اور قریب تھا کہ سچ جُج ان کا بلڈ پریشر

کی ٹھیک رہے گی؟

انھوں نے دلا دینا انداز میں ہمیں دیکھا۔

ہمارے دوست اور ہماری بیگم اس جھگڑے کو ختم کرنے کے حق میں تھے۔ یوں بھی ہم لوگ تھکے ماندہ تھے۔ اور ہوٹل پہنچ کر دوبارہ کسی اور جگہ کی تلاش میں مزید خواہش نہیں ہونا چاہتے تھے۔ مگر ہمیں یہ ٹھگی کا انداز بہت برا لگا۔ ہم نے وہاں سے واپس ہونے کا قصد کیا تو وہ خاتون مزید رعایت پر آمادہ ہو گئیں۔ جب ہم کمرے سے باہر نکل رہے تھے تو انھوں نے پکار کر مزید دو ڈالر رعایت کرنے کی پیشکش کر دی۔ مگر ہم نے سوچا جو لوگ اس قدر فریبی ہیں نہ جانے یہ بعد میں ہمارا کیا حشر کریں گے۔ ہم ہوٹل کے برآمدے سے باہر نکل رہے تھے تو ہمیں ایک نوجوان باغ میں پودوں کو پانی دیتا ہوا نظر آیا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے جھٹ دوسری طرف منہ موڑ لیا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہی وہ حضرت ہیں جنہوں نے ہم سے فون پر بات کی ہوگی۔ خیر وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

ایئر پورٹ پر ہم سے جو کرایہ طے کیا گیا تھا اس کی پوری طرح پابندی کی گئی۔ روم کا ایئر پورٹ شہر سے قریباً ۳ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہوٹل تک جاتے ہوئے ہم نے شہر کا کافی حصہ دیکھ لیا جس میں بہت سی تاریخی عمارتیں بھی تھیں، جن کے بارے میں اب تک ہم صرف کتابوں میں پڑھتے یا فلموں میں دیکھتے آتے تھے۔ اب وہ ہماری نظروں کے سامنے تھیں اور اتنی زیادہ خوبصورت نہیں لگ رہی تھیں جتنی کہ تصویروں اور فلموں میں نظر آتی ہیں۔ کشادہ اور خوبصورت سڑکوں اور باغات و سبزے کے قطعات سے گزرتے ہوتے ہم روم کے بارے میں سوچتے رہے۔ اللہ اللہ کیا شہر ہے اور اس کی کیا تاریخ ہے؟ اس قدر قدیم اور روایتی شہر ہے کہ اسے ”دوائی شہر“ کا نام دیا گیا ہے۔ جو خدا جانے کب سے آباد ہے اور آئندہ نہ جانے کب تک قائم رہے

اتنی دیر میں ٹیکسی ایئر پورٹ سے نکل کر روم کی کشادہ اور خوبصورت سڑکوں پر رواں دواں ہو گئی تھی۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ روم میں ریوے سٹیشن اور ایئر پورٹ پر حکومت نے ہوٹلوں کی بکنگ کے سلسلے میں بہت اچھا انتظام کیا ہے۔ ایک بہت بڑے بورڈ پر مختلف ہوٹلوں کے نام اور فون نمبر لکھے ہیں۔ آپ اس نمبر کا ٹپن دیاں اور براہ راست ہوٹل سے بات کر کے معلومات حاصل کر لیں اور سب کچھ طے کر کے آرام سے وہاں پہنچ جائیں۔ مگر اطالوی بہت کارگر لوگ ہیں۔ اس بندوبست کے باوجود وہ نووارد اور نا تجربہ کار مسافروں کو ٹھکنے سے باز نہیں آتے۔ مثلاً ہم دوسری بار اپنی بیگم اور ایک دوست کے ساتھ بذریعہ ریل روم گئے اور ایک ہوٹل کے مینجر سے جملہ معاملات طے کر کے بس میں سوار ہو کر ہوٹل پر پہنچے۔ یہ ہوٹل کافی دُور دراز علاقے میں تھا۔ ہوٹل پہنچے تو وہاں کاؤنٹر پر ایک خاتون بیٹھی مسکرا رہی تھیں جبکہ ہماری گفتگو کسی مرد سے ہوتی تھی۔ ہم نے انہیں اپنی ضروریات بتائیں۔ اور انھوں نے نہایت خوش اخلاقی سے رجسٹر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم نے دستخط کرنے سے پہلے عادتاً کرایہ پھر پوچھ لیا۔ انھوں نے طے شدہ کرائے سے دو گنا بتایا تو ہم حیران رہ گئے۔ ہم نے کہا۔

”ابھی ہم نے فون پر ایک صاحب سے بات کی تھی۔ انھوں نے تو اس سے نصف کرایہ بتایا تھا“

کہنے لگیں۔

”صاحب؟ کون صاحب؟ یہاں تو میری ڈیوٹی ہوتی ہے اور صبح سے میں ہی یہاں بیٹھی ہوں۔ اس وقت تو سارے ہوٹل میں کوئی مرد نہیں ہے۔“

ہم سب حیرانی سے اُنہیں دیکھنے لگے۔ بولیں۔

”کرایہ میں آپ کے لیے کچھ اور کم کر دوں گی۔ فی کمرہ ایک ایک ڈالر کی

کا۔ اس شہر کا چپہ چپہ تاریخی عمارتوں، یادگاروں اور نوادرات سے بھرا پڑا ہے۔
عالم یہ ہے کہ کسی کھنڈر میں کوئی ایک اینٹ بھی اٹھائے تو قدیم تہذیب کی نشانی مل
جاتے گی۔

موسم بہت اچھا تھا اور ہم روم کی طلسماتی نقائص میں گم ہو گئے تھے۔ مگر ٹیکسی ڈرائیور
جو نہایت صاف ستھرا اور خوش شکل نوجوان تھا اپنی زبان میں نہ جانے مسلسل کیا بولے
جا رہا تھا۔ ہم نے اطالویوں کے باٹونی ہونے کے بارے میں سنا تو تھا مگر جب دیکھا
تو مان گئے کہ مسلسل بے تکان بولنے میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ ہاں فرانس دلے
کسی حد تک مقابلہ کر سکتے ہیں مگر وہ بھی ان کا جوڑ نہیں ہیں۔ وہ اللہ کا بندہ ہمیں ہر
تاریخی عمارت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہر جگہ کا تعارف کرا رہا تھا۔ مگر قسم لے لیں
جو ایک لفظ بھی ماسوائے چند مشہور ناموں کے، ہمارے پلے پڑا ہو۔ اسے یہ
پروا بھی نہیں تھی کہ ہم اس کی بات پر کان دھر رہے ہیں اور اُسے سمجھ بھی رہے
ہیں یا نہیں۔ اُسے تو بس بولنے سے کام تھا۔ یا رخاں تنگ آ کر بولے۔

”یار اسے چپ کر آؤ۔ اس کی تو چابی ہی ختم نہیں ہو رہی۔“

ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کے تیزی سے حرکت دیتے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔ وہ
اچانک خاموش ہو کر ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگا۔ ہم نے کہا۔

”وی سپیک انگلش۔ نوٹیلین؟“

اس نے تعجب سے ہمیں دیکھا۔

”نو اتالین؟ اوتے؟“

یہ کہہ کر اس نے دوبارہ اپنی تقریر شروع کر دی۔ کمال کا آدمی تھا جسے نہ
ستائش کی منتا تھی نہ صلے کی پروا۔ بس بولنے سے سروکار تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ
وہ کوئی لپیٹہ یا مزیدار بات سُنا کر زور زور سے ہنستا اور ہماری طرف یوں دیکھتا

تھا جیسے ہم بھی اس کے مذاق سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ گھٹکوکا یہ ایک طرف
ٹریفک اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ ہم روم کے قدیم شہر میں نہیں پہنچ
گئے۔ پتلی پتلی پتھر ملی تنگ گلیاں اور پُرانے پُرانے دوریہ مکانات۔ گھسان ستھرے
ٹریفک بے پناہ تھا اور کافی تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ پتلی تنگ سڑکوں اور گلیوں
میں سے ہماری ٹیکسی بڑی تیزی سے گزر رہی تھی۔ کئی بار تو ٹکر ہوتے ہوتے بچ گئی مگر
دونوں ڈرائیوروں نے پوری قوت سے بریک مار کر حادثے کو بچالیا۔ خاص بات یہ
کہ دونوں میں سے کسی کی پیشانی پر بھی بل نہیں دیکھا۔ مسکرا کر آگے چل پڑے۔ ہمارا
ملک ہونا تو اب تک فساد ہو چکا ہوتا۔ چوڑی اور تنگ گلیوں کے دونوں طرف واقع
قدیم تاریخی عمارتوں کے بارے میں ٹیکسی ڈرائیور ہمیں بتاتا رہا۔ مگر ہم کیا کیا دیکھتے۔
روم میں تو ہر طرف تاریخ بکھری پڑی ہے۔ قریب قریب ہر عمارت قدیم اور تاریخی
ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے ان عمارتوں کو بہت احتیاط اور سلیقے سے محفوظ
رکھا ہے۔ بہت سے کرشل علاقوں میں ان کی ضروری مرمت بھی کی ہے مگر عمارت کی
اصل شکل و صورت کو برقرار رکھا ہے۔ ان میں بعض عمارتوں میں ہوٹل۔ ریسٹوران،
دکانیں اور سینما بن گئے ہیں۔ باہر سے یوں لگتا ہے جیسے ایک پرانی تاریخی عمارت
ہے۔ اندر قدم رکھو تو آنکھیں کھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

گلیاں اور بازار انشعب و فراز میں تھے۔ کیس پتلی سی سڑک اور پر کو جا رہی ہے
تو کہیں نیچے ڈھلان میں چلی گئی ہے۔ دراصل روم کئی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ ایک
روایت یہ بھی ہے کہ روم کا شہر سات پہاڑیوں پر آباد تھا اور ظاہر ہے کہ ابھی
تک جوں کا توں ہے۔ روم والوں کو اپنے تاریخی شہر اور قدیم ثقافت پر اگر ناز ہے
تو سب سے جانتے ہیں۔ یہاں قدم قدم پر قدیم تہذیب و تاریخ کی نشانیاں موجود ہیں۔
کسی اور ملک میں غالباً اتنی تاریخی عمارتیں اور یادگاریں نہیں ہوں گی جتنی روم کے

ردشیاں اور لکڑی کے چکر دار زینے۔ ہوٹل زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن تھا بے حد آرام دہ۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارا سامان لا کر اندر رکھ دیا اور ہم نے اسے ڈھائی ہزار لیرا گن کر دے دیئے۔ وہ بڑے دوستانہ انداز میں ہمیں دیکھتا رہا۔ یار خاں نے حکم دیا۔

”یار اسے ٹپ بھی دونا۔ کیا سوچے گا ہم پاکستانیوں کے بارے میں؟“
ہم نے کہا۔

”سوچے گا تو ہمارا کیا بگاڑے گا۔ مگر ٹپ دے کر شاید ہمارا بہت کچھ بگڑ جاتے گا۔ ہمیں تو خود چندے کی ضرورت ہے۔ پتہ ہے اب ہمارے پاس کتنے لیرا بچے ہیں؟“
یار خاں کا منہ اُتر گیا۔ کہنے لگے۔

”یار پردیس میں ذیل کرا دیا ہے تم نے۔ خیر۔“
”برادقت تو بادشاہوں پر بھی آتا ہے۔“

ٹیکسی والا مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا مگر جانے سے پہلے کاؤنٹر پر موجود ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ گپ شپ کرنے سے باز نہ آیا۔ ہوٹل کے میجر، جو بعد میں مالک بھی نکلے، تمام اطالویوں کی طرح ہنس مکھ تھے۔ انھوں نے ہوٹل کے باہر ایک بورڈ لگا رکھا تھا جس پر لکھا تھا کہ یہاں انگریزی جاننے والا عملہ موجود ہے۔ ہم خوشی خوشی ان سے مخاطب ہوئے تو وہ سر ہلانے لگے۔ کافی دیر بعد بولے۔

”میرا نام گویدو ہے۔ انگریزی جانتا ضرور ہوں مگر آپ کی طرح اعلیٰ قسم کی انگریزی سے نا بلد ہوں۔“
یار خاں بولے۔

”یار یہ تو تمھاری انگریزی کی تعریف کر رہا ہے۔ تم تو چھپے رستم نکلے۔“

ایک مرے میں واقع ہیں۔ جس چینر کے بارے میں پوچھو ہزاروں سال سے کم پُرانی نہیں ہے۔ اور بدستور قائم و دائم ہے۔ مقام شکر ہے کہ عمارتوں اور درو دیوار کے برعکس انسانوں کو فنا ہے ورنہ اگر کہیں اللہ تعالیٰ مہربان ہو کر وہاں کے رہنے والوں کو بھی عمارتوں کی طرح حیاتِ دوام بخش دیتا تو ذرا سوچتے کیا ہوتا۔ یعنی ذرا تصور کیجئے کہ ایک دس ہزار سال پُرانی عمارت کے سامنے دو ہزار سال کی عمر کے ایک بزرگ ٹافیاں بیچتے ہوئے یا آتس کریم فروخت کرتے ہوئے نظر آتے۔

واللہ۔ کیا خوب منظر ہوتا وہ بھی!!

ایک بہت لمبی اور پتلی پتھروں کی سڑک پر سے گزرتے ہوئے، چڑھائیاں چڑھ کر آخر کار ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ اٹلی والوں کی یہ بات قابلِ تریف ہے کہ پُرانے شہر کی بے انتہا پتلی گلیوں میں بھی وہ ایک جانب اور اگر گنجائش ہو تو دونوں جانب اپنی کاروں کو ممبر سے ممبر لاکر صراطِ مستقیم میں پارکنگ کرتے ہیں۔ درمیان میں صرف ایک گاڑی کی آمد و رفت کے لیے جگہ باقی رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ شیطان کی آنت کی مانند لمبی اور بے حد تنگ بِل کھاتی ہوئی گلی یا سڑک پر ایک وقت میں ایک ہی جانب ٹریفک چل سکتا ہے۔ اصولاً تو ان گلیوں اور سڑکوں پر دن دے ٹریفک ہونا چاہیئے۔ مگر اٹلی والے بلاوجہ قاعدے قانون میں اپنا وقت ضائع کرنا فضول سمجھتے ہیں۔ بس چل سوچل پہ یقین رکھتے ہیں۔ وہ ان تنگ گلیوں میں وہ کبوں کر اتنی تیزی سے ڈرائیونگ کرتے ہیں؟ اس کا نظارہ ہم نے اگلے ہی دن کر لیا۔ مگر پہلے ذرا ہوٹل کے بارے میں کچھ سن لیجئے۔

ہوٹل کا نام ایلیٹ تھا۔ باہر سے یہ ایک تنگ سڑک پر واقع چھوٹا سا ہوٹل نظر آتا تھا مگر جب اندر گئے تو نہایت کشادہ اور خوبصورت پایا۔ سنگ مرمر کا فرش دیروم میں بہت عام ہے، لکڑی کی دیواریں، پرانی وضع کا فرنیچر، بیش قیمت قالین، فانوس

آپریٹر کے ذرائع بھی گویہ صاحب ہی سرانجام دے رہے تھے۔ پی آئی۔ اے کا نام سن کر بہت خوشی کا اظہار کیا۔

”دیری گڈ۔ پی آئی اے۔ آئی نو۔ گڈ پیپل“

پی آئی اے کو یہ سرٹیفکیٹ عطا کرنے کے بعد انھوں نے ٹیلی فون ملانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف کسی غیر ملکی نے فون اٹھا کر اطالوی زبان میں تقریر شروع کر دی۔ ہم نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

”یہ پی آئی اے کا دفتر ہے؟“

ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب ملا۔

”جی ہاں“

ہم نے کہا۔

”مینجر یا کسی اور آدمی سے ملاؤ۔“

بولے۔

”کوئی نہیں ہے۔ بس اکیلا ہوں“

پوچھا۔

”آپ کون ہیں؟“

کہنے لگے۔

”چوکیدار۔ پرسوں صبح فون کرنا تو مینجر مل جاتیں گے۔ خدا حافظ۔ اور

فون بند کر دیا۔

لیجئے۔ امید کی ایک کرن تو غائب ہو گئی۔ ہمارا خیال تھا شاید پی آئی اے والوں

کو راشد صاحب وغیرہ کے بارے میں علم ہو گا۔ مگر وہاں تو پی آئی اے کا علم ہی لاپتہ

تھا۔ دن کا وقت تھا۔ ہم حیران کر پی آئی اے والے کہاں چلے گئے؟ پھر پاکستانی

ہم نے کہا۔

”تعریف نہیں کر رہا۔ دراصل یہ ہم سے بھی گئی گزری انگریزی جانتا ہے“

بہر حال گویہ صاحب نے حسب معاہدہ ہمیں تیز، بیڈ والا کرہ دے دیا اور

کرایہ بھی دہی بتایا جو ایرپورٹ پر طے ہو چکا تھا، یعنی اس ڈالر۔ کمرے کی چابی

ہمیں دینے کی بجائے انھوں نے پکار کر کہا ”اینا اینا“ یہ نام سن کر یار خاں کے

کان کھڑے ہو گئے۔ منور اور ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ کانسٹرکٹ کے پیچھے باورچی خانہ

سے ایک چودہ پندرہ سال کی صحت مند اور خوش شکل لڑکی نکل کر آئی جسے گویہ صاحب

نے اپنی زبان میں ہدایات دیں اور چابی اس کے حوالے کر دی۔ فخر یہ کہنے لگے

”یہ میری بیٹی ہے اینا۔ انگریزی نہیں جانتی۔“

ہمارا سامان انھوں نے خود اٹھا لیا اور اینا کی قیادت میں ہم سیڑھیاں چڑ

کر کمرے میں پہنچ گئے۔ خاصا آرام دہ اور سجا ہوا کمرہ تھا۔ باہر تھروم بھی اس کے

ساتھ ہی تھا۔ بعد میں تجربے نے بتایا کہ یورپ میں جن کمروں کے ساتھ با تھ روم ہو

ہے وہ ہنگے ہوتے ہیں۔ گویہ صاحب نے پر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں خدا جانے

کیا ہدایات دیں اور اینا سمیت رخصت ہو گئے۔

اب ہمیں اپنی حالت زار کے بارے میں سوچنے کا موقع ملا۔ فور کیا تو خاصے ناگہ

حالات تھے۔ یار خاں اور منور کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”یار کمرہ تو لے لیا مگر کرایہ کیسے دے گے۔ اور ہم کھائیں گے کیا؟ پیسے تو

ہیں نہیں“

ہم نے کہا۔

”اللہ مالک ہے“

اور فون پر پی آئی اے کے دفتر سے رابطہ قائم کرنے کو کہا۔ معلوم ہوا ٹیلی فون

یاد گاریں تھیں جن کے نام ہمیں معلوم نہیں تھے مگر سب کے سب نادر الوجود تھے۔ گلیاں، مٹرکیں، بازار، شاپنگ سینٹر خاصے صاف ستھرے تھے۔ لوگ بہت ہنس مکھ اور بااخلاق۔ ہم ایک پلازا میں پہنچ گئے۔ ہر طرف ایک جیسی پُرانی طرز کی عمارتیں تھیں جن کے آگے نہایت بلند ستونوں والے وسیع برآمدہ تھا۔ یہ بازار گولائی میں تھا۔ عمارتیں خدا جانے کس سن عیسوی میں بنی ہوں گی مگر یوں لگتا تھا جیسے ان کی مسلسل مرمت اور دیکھ بھال ہوتی رہی ہے۔ ان کے اندر سینما بھی تھے، دوکانیں اور ریسٹوران بھی، کلب اور تماشہ گاہیں بھی۔ ہم نے صرف کھڑکیوں میں سے ہوتے سامان کو دیکھنے پر اکتفا کی کہ اس سے زیادہ کی استطاعت نہیں تھی۔

یارخاں بہت خوش اور تروتازہ رہے۔ ہر طرف خوبصورت، صحت مند لوگ، ماہتاب چہرہ خواتین، آفتاب چہرہ مرد۔ اتنے بہت سے غیر ملکی اور وہ بھی حسین و جمیل ہم نے کابھی کوئی جاکھیں تھے۔ پھر اس پرستم ان کا لباس، آرائش اور میک اپ بعد میں ہم نے یورپ کے اور ملک بھی دیکھے مگر روم میں اور اطالوی قوم میں ہم نے جو بے تکلفی، خوش اخلاقی اور زندہ دلی پائی وہ کہیں اور نہیں دیکھی۔ قد و قامت، صورت شکل اور عادات و اطوار میں انہیں بہت حد تک پنجابیوں کی طرح پایا۔ سارے یورپ میں یہ منظر روم ہی میں دیکھا کہ ایک پارک میں بازی گر کا تماشا ہو رہا ہے اور دیکھنے والے مرد و عورت کا ایک ہجوم اکٹھا ہے۔ فٹ پاتھ پر پامسٹ اور دوائیں بیچنے والے بھی گاہکوں میں گھرے نظر آتے مگر نہایت صاف ستھرے اور سلیفے سے سامان بجاتے ہوتے۔ جسے دیکھو کون آتس کریم ہاتھ میں لیے گھوم رہا تھا۔ کون آتس کریم اس وقت تک لاہور میں متعارف تو ہو چکی تھی مگر عام نہیں ہوتی تھی۔ آتس کریم ہماری بھی کمزوری ہے اور یارخاں کے منہ میں بھی پانی بھرا رہا تھا۔

آخر نہیں رہا گیا۔ ملتینا نہ بچے میں کہنے لگے۔

سفارت خاتے سے فون ملوایا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ ایک بڑے افسر پاکستان سے آتے ہوئے ہیں اس لیے سارا عملہ انہیں دینس دکھانے لے گیا ہے۔ وہاں بھی ایک اطالوی چوکیدار صاحب موجود تھے جن کی انگریزی کو سمجھنا خود انگریزوں کے لیے بھی آسان نہ تھا۔ گویا ہمیں نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب واحد امید یہ باقی رہ گئی تھی کہ دوسرے دن رات کو (روم کے وقت کے مطابق صبح چار بجے) پاکستان سے باقی ماندہ یونٹ بھی پہنچ رہا تھا۔ سوچا انہیں لینے کے لیے تو راشد صاحب ضرور جائیں گے۔ ان سے وہاں رابطہ ہو جاتے گا۔

یارخاں کہنے لگے۔

”بھاتی میری بات سنو۔ روم اتنا بڑا شہر ہے۔ اس میں ہم کہاں ہیں راشد صاحب نہیں جانتے۔ وہ کہاں ہیں ہمیں معلوم نہیں ہے۔ یونٹ والے کہاں ٹھہریں گے۔ یہ بھی ہمیں معلوم نہیں ہے۔ یا تم تو مردادو گے“

ہم نے کہا۔

”دیکھو خاں صاحب ان مسائل پر لعنت بھیجو۔ اللہ نے روم دیکھنے کا موقعہ دیا ہے۔ کل رات تک کے لیے پریشانی چھوڑو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ جو ہوگی دیکھی جاتے گی۔ اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

یارخاں کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے مگر وہ اور منور فوراً تیار ہو گئے۔ اور ہم نے آس پاس کے علاقے میں گھومنا شروع کر دیا۔ ہوٹل سے ہم نے احتیاطاً ایک کارڈ بھی لے لیا تھا تاکہ راستہ بھول جائیں تو کسی کو کارڈ دکھا کر ہوٹل تک تو پہنچ جائیں۔

دو تین گھنٹے تک ہم حیرانی کے عالم میں گھومتے اور روم دیکھتے رہے۔ ریلوے اسٹیشن واقعی بالکل نزدیک تھا۔ آس پاس درجنوں تاریخی عمارتیں ”کلیسا“ مجسے اور دوسری

”یار۔ اور کچھ نہیں تو آتس کریم ہی کھلا دو۔“
ہم نے کہا۔

”آپ کو پتہ ہے کہ ہم بھی بہت شوقین ہیں۔ مگر پیسے نہیں ہیں۔“
انہوں نے سامنے کا دَنڑ پر جا کر خوبصورت مگر تنومند عورت سے پوچھا۔
”ہاؤ میچ؟“

اس نے مسکرا کر انگلی اٹھائی ”ہنڈ ریٹ لیرا۔“
دوڑے دوڑے واپس آئے۔

”صرف ایک سو لیرا کی ہے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔“
ہم نے کہا۔

”صرف ایک سو لیرا!؟ پتہ ہے ہمارے پاس کُل کتنے لیرا ہیں اور آپ یوں
کہہ رہے ہیں جیسے ہم کوئی امریکی لکھ پتی ہوں۔“
وہ شرمندہ ہو گئے۔ کہنے لگے۔

”اچھا ایک کون لے لیتے ہیں۔ تینوں باری باری کھالیں گے۔“
متوڑنے فوراً کہا۔

”مجھے آتس کریم پسند نہیں ہے۔ آپ دونوں کھائیے۔“

”لو۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا۔ ایسا کرو۔ تم آتس کریم کھا لینا۔ میں کون کھا
لوں گا۔ یاد آخر روم کی کون آتس کریم چکھنی تو چاہیے نا۔“

ہمیں ان کے نذیرے پن پر بالکل غصہ نہیں آیا۔ فلک کی کج رفتاری پر البتہ ایک
آہ سرد کھینچی۔ کیا وقت ہے کہ ایک کون آتس کریم بھی سالم نہیں کھا سکتے ہیں۔ مگر پھر سوچا
جہاں ستیاناس۔ وہاں سوا ستیاناس۔ پیسے تو دیے بھی کم ہیں۔ ایک ایک کون کھانے میں
برج کیا ہے؟ اتنی دیر میں یار خاں ایک اور کھوکھے پر پہنچ گئے جہاں ایک جوڑا دوکانداری

کر رہا تھا۔ دونوں ہی خوش شکل تھے مگر ظاہر ہے کہ یار خاں کو لڑکی زیادہ بھلی لگی کھنے لگے۔
”دیکھیں۔ وہ اٹلی کی فلم تھی نا۔ چاولوں والی۔ اس کی ہیر و تن کی طرح ہے۔“
ان کا اشارہ ”بٹر رائس“ کی طرف تھا۔

آتس کریم کچھ تو تھی لذیذ کچھ حالات کی سنگینی نے اور زیادہ مزیدار بنا دیا تھا۔
کون آتس کریم ہاتھوں میں تھام کر ہم نے بھی دوسروں کی طرح مٹر گشت شروع کر دیا۔
دیکھا کہ ہر گزرنے والا (یا گزرنے والی) خوش اخلاقی سے دیکھ کر مسکراتا ہے اور کچھ
نہ کچھ کتا ہوا جاتا ہے۔ سڑکوں پر جگہ جگہ ٹھیلے والے کھڑے آدازیں لگا رہے ہیں۔
ایک صاحب تروزی بیچ رہے تھے۔ اتھاتی سُرُخ تروزی تھا۔ ہمارے شہروں کی طرح کٹی
ہوتی قاشیں برف کی سسوں میں لگی ہوتی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک ٹکڑا سو
لیرا کا ہے۔ لوگ پنجابیوں کی طرح کھڑے ہو کر کھاتے اور ٹھیلے کے نیچے لٹے ہوتے
ڈبے میں چھلکے ڈال دیتے۔ کیا مجال جو ذرا سی بھی گندگی ہو یا کھٹیاں نظر آئیں۔
فضا میں گرد و غبار کا نام و نشان نہیں تھا۔ ہوا میں تازگی اور فرحت تھی۔ ہر طرف روشن
روشن سماں نظر آ رہا تھا۔ ہم ان نظاروں میں کھو گئے۔ ایک جگہ ایک خوبصورت لڑکی
بُھنی ہوئی پھیلیوں کی قسم کی کوئی چیز فروخت کر رہی تھی۔ یار خاں نے پھیلیوں سے زیادہ
لڑکی سے متاثر ہو کر پوچھا۔

”ہاؤ میچ؟“

اس نے مسکرا کر انگلی اٹھا دی

”ہنڈ ریڈ لیرا۔“

یار خاں تو اس انداز پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ کہنے لگے۔

”یار ایک پڑیا خرید لو۔ بے چاری نہ جانے کب سے کھڑی ہوگی۔ یہ پھیلیاں
دیکھنے میں مونگ پھلی سے مشابہ ہیں اور اسی طرح پڑیا بنا کر فروخت کی

جار ہی تھیں جس طرح ہمارے ہاں مونگ پھلی یا چا جو گرم فروخت کیا جاتا ہے۔ لڑکے نے اطالوی زبان میں اور بھی باتیں شروع کر دیں جو سننے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہمارا دل بھی پیچ گیا۔ ہم نے کہا۔

”اے۔۔۔“ اس نے ایک پڑبانا کر ہمارے حوالے کی۔ ہم نے میرا کاسٹہ نکالا تو یار خاں چل گئے۔ بولے۔
”یہ میں اسے دوں گا۔“

ان کی بچکانہ خواہش پوری کرنے کے لیے ہم نے اٹھتی کے برابر وہ سیکہ یار خاں کو دے دیا جو انہوں نے انتہائی خلوص اور محبت کے ساتھ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر لڑکی کو پیش کر دیا۔ ان کی اس حرکت پر وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اسے ان کا یہ انداز اس قدر پسند آیا کہ پھلیوں کی ایک اور پٹریہ اُس نے اسی انداز میں دونوں ہاتھوں پر رکھ کر یار خاں کو نذر کی اور اشارے سے بتایا کہ یہ تحفہ ہے۔ اسی بازار میں ہمیں ایک نوجوان اور خوش پوش سپانوی مل گیا۔ اس نے بذات خود ہمارے پاس آکر تعارف کرایا۔ ہم نے بھی اپنا تعارف کرایا۔ یار خاں سے مل کر وہ بہت خوش ہوا۔ سپانوی طرز کی انگریزی میں بولا۔

”اوہو۔ آپ خان ہیں۔ پھر تو بہت بڑے آدمی ہوں گے؟“

ہم نے کہا۔

”بہت بڑی ریاست ہے ان کی۔ دس توپوں کی سلاخی دی جاتی ہے۔“

وہ تو بس یار خاں کا مُرید ہو گیا۔ ہمارے ساتھ ساتھ گھومتا رہا۔ کبھی فلم دکھانے کی پیشکش کرتا۔ کبھی نامٹ کلب کی دعوت دیتا۔ کبھی خوبصورت لڑکیوں سے ملانے کی پیشکش کرتا۔ یار خاں کہتے رہے کہ یار۔ اس کی بھی سُن لو۔ مفت میں کھانا تو بل ہی جلتے گا۔ مگر ہم کو شک تھا کہ یہ مہربانی بلا وجہ نہیں ہو سکتی۔ ہم اس سے جان چھڑانے

کا جتنی کوشش کرتے وہ اسی قدر سختی ہوتا۔ بار بار ہمارے ہونٹل کا پتہ پوچھ رہا تھا۔ ہم نے یار خاں سے کہا۔

”خبردار۔ یہ نہ بتانا۔“

کہنے لگے۔

”کیوں۔ کیا یہ ہمارے کمرے میں ہم رکھ دے گا؟“

ہم نے کہا۔

”یہ بھی بعید از امکان نہیں ہے۔“

ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل کوششوں کے بعد بالآخر وہ حرف مدعا زبان پر لایا۔ دراصل وہ حشیش، پیرس اور میری جو آنا کی طلب میں تھا۔ اُس وقت تک ہیر دتن اتنی مقبول عام نہیں ہوتی تھی مگر پاکستانیوں کے بارے میں خدا جانے کسی طرح یہ تصور عام ہو گیا تھا کہ وہ منشیات مہیا کر سکتے ہیں۔ سپانوی اس کے عوض ہمیں مَنہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھا۔ ہم نے بتیرا یقین دلایا کہ بھاتی۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے مگر وہ بار بار یار خاں کی طرف بلجیانا لگا ہوں سے دیکھتا اور کہتا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گریٹ خان کے پاس بھی نہ ہو؟“

یار خاں جل بھن کر راکھ ہو گئے۔ بولے

”کیا اس کو میں شکل سے منشیات فروش مکتا ہوں؟“

ہم نے کہا۔

”ظاہر ہے ورنہ اس طرح ریشہ خلی کیوں ہوتا۔“

جب دیکھا کہ وہ جان چھوڑنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تو ہم نے ٹلنے کے لیے اس سے کہا کہ کل صبح دس بجے اسی جگہ ہمیں ملنا۔ ہم بخاری دلی مراد پوری کر دیں گے۔ وہ خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ ہم سب کے گالوں کو بوسہ دیا اور خان صاحب کی خدمت

میں ایک خوبصورت لائٹ پریش کیا جو یار خاں نے فوراً قبول کر لیا۔
 روم کی رعنائیاں اور رنگینیاں اپنی جگہ مگر بھوک کے مارے بُرا حال ہو گیا تھا۔
 پیسے ہمارے پاس بہت کم تھے اور وہ ہم نے ایمر جنینی کے لیے سنبھال کر رکھ لیے تھے۔
 اور کھانا کھاتے بغیر بھی گزارہ نہیں تھا۔ ہم ہوٹل واپس پہنچے تو مسٹر گویدو اور اینا
 کاؤنٹر پر موجود تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کی ہاتھیں کھل گئیں۔ یار خاں بولے۔
 ”یار دیکھو۔ ہمارے کتنے دوست بن گئے ہیں؟“

ہم نے کہا۔ ”جب بل ادا نہیں کرو گے پھر دیکھنا کیا سلوک کریں گے تمہارے ساتھ۔“
 وہ گھبرا گئے۔

”واقعی۔ یار ہمارا حشر کیا ہوگا؟“

ہم ٹپلتے ہوئے ریٹورنٹ کی طرف چلے گئے جہاں اینا کی ایک ہمشکل سیر پر
 ویٹریس کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ عمر اور حسن و جمال دونوں میں اس سے
 زیادہ تھی۔ بعد میں معلوم ہوا اس کی بہن ہے۔ ہمیں دیکھ کر مسکراتی اور فی الفور اطالوی
 زبان میں باتوں کی مشین گن چلا دی۔ ہم نے کہا۔

”نوابین۔ پیکی انگلش۔“

اس نے مایوسی سے ہمیں دیکھا۔

”اوہ!“

ہم اس سے یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ اگر ہم ہوٹل میں کھانا کھالیں تو یہ بل ہمیں فوراً
 نقد ادا کرنا ہوگا یا ہمارے ہوٹل کے بل کی رقم میں شامل ہو جائے گا؟ مگر اس کے پتے
 کچھ نہیں پڑا۔ تنگ آکر ہم نے مسٹر گویدو سے مدد لینے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ موجود نہیں
 تھے۔ ہرچہ بادا باد کہہ کر ہم نے بطور احتیاط چلتے اور دوٹی کھن کا آرڈر دیا تاکہ اگر
 بل نقد بھی ادا کرنا پڑ جائے تو جیب پر بار نہ گزرے۔ وہ لپک بھپک چلتے آئی

مگر دودھ ندارد۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ انگلستان کے سوا یورپ کے کسی بھی ملک
 میں چائے میں دودھ نہیں پیتے۔ بڑی شکل سے لڑکی کو دودھ کے بارے میں
 سمجھایا۔ کچھ تو بھوک زیادہ چمک رہی تھی اور کچھ چائے بھی بہت لذیذ تھی۔ لطف آگیا۔
 بریڈرول کے ساتھ مکھن کے چھوٹے چھوٹے پیکیٹ اور اسی سائز کے جیم کے پیکیٹ
 بھی تھے۔ کھایا تو ان کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ یار خاں نے کہا۔

”کیوں نہ ہو۔ بالکل خالص چیزیں ہیں۔ ہم تو ملاوٹی کھا کھا کر اصلی خوراک کا مزہ
 ہی بھول گئے ہیں۔“

چائے سے لطف اندوز ہونے کے بعد یار خاں کو پینے کے لیے پانی کی خواہش ہوئی۔
 ہم نے ویٹریس کو بلایا تو یار خاں نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں روک دیا اور بولے۔

”بس۔ اس سے مجھے بات کرنے دو۔“

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

”مگر کیوں؟“

یار خاں بولے۔

”یار اس کے سامنے انگریزی بولنے میں کوئی ڈر نہیں ہے۔ یہ تو مجھ سے بھی

گنتی گزری ہے۔“

پھر ان کے اور ویٹریس کے مابین یہ مکالمہ ہوا۔

یار خاں۔

”مائی نیم یار خاں۔ دیات از یورنم؟“

ویٹریس۔

”اطالوی زبان میں ایک لمبی تقریر اور آخر میں ”جینا“

یار خاں۔

”جینا۔ یو آر بیوٹی فُل۔“

جینا شرمائی۔ پتہ یہ چلا کہ خواتین کی تعریف خواہ کسی بھی زبان میں کی جلتے وہ سمجھ جاتی ہیں۔

یارخاں۔

”یو۔ اینا۔ سسٹرز؟“

جینا۔

”ایک طویل تقریر جس کا مطلب یہ تھا کہ ”جی ہاں“۔

یارخاں۔

”آئی دانت دائرہ“

جینا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ دس منٹ تک اُسے دائرے کے بارے میں سمجھاتے رہے۔ وہ باہر جا کر اینا اور ایک اور لڑکے کو بلا کر لے آئی مگر کوئی نہ سمجھ سکا کہ دائرہ کیا بلا ہوتی ہے۔ آخر تنگ آ کر یارخاں نے کچن میں جا کر پانی کا بیپ دکھایا۔ وہ لوگ سمجھ تو گئے مگر حیران تھے کہ ہمیں پانی کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ برتن ہمیں نہیں دھونے پڑے ہمیں نہیں دھونے۔ دانت ہمیں نہیں صاف کرنے۔ شیوہمیں نہیں بنانی پھر پانی کس لیے؟ یارخاں نے ایک گلاس اٹھا کر لباب بھرا اور منہ سے لگا کر غٹ پی گئے۔ وہ سب پیچھے اور منہ کرتے رہ گئے کہ یہ پانی پینے کے لیے نہیں مگر انھوں نے دوسرا گلاس بھی نوش جان کر لیا۔ ہم حیران تھے کہ کیا اٹلی کے لوگ پانی نہیں پیتے؟ پتہ چلا کہ طہارت کے علاوہ پانی محض دھونے دھلانے اور شیوہ بنانے کے کام ہی آتا ہے۔ اگر کبھی پینے کو جی چاہے تو وہ پانی دوسرا ہے۔ اٹلی ہی نہیں سارے یورپ میں قریب قریب یہی رواج ہے۔

چاتے اور مکھن روٹی کھا کر کچھ جان میں جان آگئی تھی مگر اس خیال سے جان جاری تھی کہ بل کی ادائیگی کے موقع پر ہم پر کیا گزرے گی۔ بہر حال۔ بل لانے کا اشارہ کیا

اور اس نازنین نے میز پر سے ایک کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر اس پر کچھ لکھ کر ہمارے حوالے کر دیا۔ نو سو لیرا کے لگ بھگ بل تھا۔ ہم نے جیب سے قلم نکالا اور اسی کاغذ کے پُرزے پر دستخط کر دیتے۔ اس نے مسکرا کر بل سنبھالا اور رخصت ہو گئی۔ یارخاں خوش ہو گئے۔ بولے ”چلو۔ کھانے کی مشکل تو آسان ہوتی۔ اب رات کو خوب جی بھر کر ڈنر کھائیں گے۔“

ہم پھر ہوٹل سے نکل گئے۔ پیدل جہاں جہاں تک جاسکتے تھے گھومتے رہے ایک دو بار بس میں بھی سفر کیا۔ بسیں لوگوں سے پُر تھیں اور دیکھا کہ قطار بندی کوئی نہیں کرتا۔ ہم ایک بس میں سوار ہونے کے لیے کھڑے تھے۔ بس آئی تو ہڑبگ بچ گیا۔ اور موٹی موٹی خواتین نے ہمیں دھکے دے کر بٹھا دیا اور خود بس میں سوار ہو گئیں۔ کم از کم یورپ کے کسی ملک میں ہم اس قسم کی حرکت کی توقع نہیں رکھتے تھے مگر یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ اٹلی والے بہت سی باتوں میں یورپ سے مختلف ہیں اور ہماری طرح ہیں۔ بد نظمی، شور، ہنگامہ پسندی، زندہ دلی، کھانا پینا اور خوش باش رہنا۔ ایک منٹ میں آپ سے دوستی بنالیں گے۔ اصول اور قاعدے قانون کو ہماری ہی طرح خاطر میں نہیں لاتے۔ اپنی جیب اور رقم سے ہر وقت ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ درنہ کوئی صاحب ہاتھ کی صفائی دکھا جاتیں گے۔ حسب توفیق غلط بیانی۔ سہ کام لینا بھی بُرا نہیں سمجھتے۔ نو سربازی کی وار دایتیں بھی سیاحوں اور اجنبیوں کے ساتھ ہوتی رہتی ہیں۔ ریلوے سٹیشن اور ایئر پورٹ کے علاوہ پُر ہجوم اور بارونق بازاروں میں غیر ملکیوں کو دیگر مختلف حیلوں بہانوں سے ٹھکنے میں مصافقہ نہیں سمجھتے۔ کرنسی کے زیادہ اچھے دام دلانے کے بہانے بھی سیاحوں کی حجامت بنا دیتے ہیں۔ رنگت اور نقش و نگار کے علاوہ عادتوں میں بھی یہ بہت حد تک مشرقی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں مشترکہ خاندانوں کا رواج ختم ہو چکا ہے مگر اٹلی میں ابھی تک باقی ہے۔ جذباتی اور خاندانی

سے چوک میں وہ قوارہ واقع ہے جو دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ روم جانے والا ہر سیاح دیگر مقامات کی طرح اس قوارے کی بھی زیارت کرتا ہے اور اس میں نہتے پھینکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس طرح جو بھی خواہش یا آرزو کی جاتے وہ پوری ہوتی ہے اور اس قوارے میں جو کوئی بھی سکے ڈالتا ہے؛ وہ دوبارہ روم ضرور آتا ہے۔ اس حد تک تو ہم بھی تصدیق کر سکتے ہیں۔ دوبارہم نے سکے پھینکے اور تین بار روم گئے۔ تیسری بار مصروفیت کے باعث قوارے پر نہیں گئے۔ نتیجہ یہ کہ چوتھی بار روم کا سفر اختیار نہیں کیا۔ شاید یہ کہا دیتیں بھی کسی حد تک درست ہی ہوتی ہیں! روم کے آس پاس کے علاقوں میں بھی قدیم تاریخی یادگاروں اور باغات کا اژدہام ہے۔ ان جگہوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہندوستان کے منل بادشاہوں کی طرح روم کے شاہوں کو بھی آبِ رواں، قواروں، حوضوں اور غسل خانوں کا شوق تھا اور اس کے لیے انھوں نے مغللوں کی طرح بہت پیچیدہ کسم پستیم ایجاد کیا تھا بعض مقامات پر تو چھوٹی چھوٹی نالیوں کا جال سا بچھا ہوا ہے اور پانی مختلف النوع قواؤں اور جھروں میں رواں دواں عجیب و غریب طسقاتی منظر پیش کرتا ہے۔ روم کے لوگ تکلف اور بناوٹ پسند نہیں کرتے۔ نظم و ضبط کی پابندی کے معاملے میں بھی ہماری طرح ہیں۔ شورشِ رابا اور دھکم پیل مغرب کے دوسرے ملکوں میں ناپید ہے۔ مگر روم میں عام ہے لطف یہ کہ اٹلی دالے اپنی ان عادات پر ہماری طرح قطعی شرمسار یا نامد نہیں ہوتے انھوں نے اپنی عادات، رسم و رواج اور طور طریقوں میں تبدیلی کرنے کی مطلق ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ اگر کوئی ٹوٹے تو شلنے اچکا کر کہیں گے۔ تو پھر کیا ہوا؛ جانتے نہیں، ہم اطلاوی ہیں!

رات کا کھانا ہوٹل کے ریسٹوران میں کھایا اور زندگی میں پہلی بار ”پیزا“ چکھا۔ یار خاں اور منور نے اٹکل سے اطلاوی کھانے منگاتے جو ان کے حلقے سے نہیں اترتے

رشتوں کو آج بھی وہاں اہمیت حاصل ہے۔ بوڑھے ماں باپ اولاد کے ساتھ رہتے ہیں اور وہ ان کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں۔ یہ منظر میں نے صرف روم میں دیکھا کہ پُرجوم اور کچھا کچھ بھرے ہوئے ریسٹورانوں کے باہر کاروں میں پورا خاندان بھر کر آیا، بڑی بی کاریں بیٹھی رہیں، ماں باپ اپنے چھوٹے بڑے بچوں کو سمیٹ کر ریسٹوران میں چلے گئے۔ بہت چھوٹی بچی بڑی اماں کی تحریل میں چھوڑ گئے۔ اب باری باری ریسٹوران کے اندر سے میاں بیوی باہر آتے ہیں اور بڑی اماں کو کھانے پینے کا سامان پہنچاتے ہیں۔ خاندانی یکجہتی اور رشتوں کا یہ احساس اب یورپ میں معدوم ہو چکا ہے۔

روم قدیم و جدید کا امتزاج ہے اور بہت خوبصورت اور دلکش شہر ہے۔ تاریخی یادگاریں، عمارتیں، میوزیم، گرجا، قوارے قدم قدم پر حیرت میں مبتلا کیے دیتے ہیں۔ ویٹیکن میں پوپ کی رہائش ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں وہ ایک الگ خود مختار سلطنت ہے۔ بہت مختصر لیکن آج بھی طاقت اور اختیار سے بھرپور، روم کے میوزیم تو دیکھنے کے قابل ہیں، ہی مگر ویٹیکن کے میوزیم بھی قابلِ دید ہیں۔ نوادرات اور عجائبات کا اتنا بڑا اور قیمتی ذخیرہ کسی اور ملک کی قسمت میں کہاں جس سے روم مالا مال ہے۔ محض روم ہی نہیں، اٹلی کا گوشہ گوشہ چشم حیراں کے لیے عجائب گھر ہے۔ روم کے قدیم شہر میں گھومتے تو اکثر مقامات پر قدیم لاہور یاد آ جاتا ہے۔ وہی اینٹوں کی پتلی اور تنگ کلیاں مگر ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ صاف۔ اگرچہ یورپ کے دوسرے ملکوں کے معیار سے انھیں گندہ کہا جاسکتا ہے۔ پتلی اینٹوں سے بنی ہوئی قدیم عمارتیں چوک اور چوراہے۔ جن مقامات کو دُنیا بھر میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہے انھیں دیکھو تو نہایت معمولی نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ بوسیدہ سی کشادہ سیڑھیاں ادپر کے بازار سے نیچے کے بازار میں اُترتی ہیں۔ لیجئے یہ مشہور زمانہ سپینش سٹیپ ہیں۔ ایک چھوٹے

گاڑیوں نے چشم زدن میں اپنے عقب میں حدنگاہ تک ایک طویل قطار کھڑی کر دی تھی اور ہر کوئی ٹریفک میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ ہم نے یارخاں کو بھی جگا کر یہ تماشا دکھایا۔ ہم تو تیار ہو کر ناشتہ کرنے چلے گئے مگر یہ ٹریفک جام دو گھنٹے تک رہا۔ پولیس سائرن بجاتی ہوئی نازل ہو گئی اور اس نے خدا جانے کس طرح مشکل میں پھنسے ہوئے لوگوں کو نجات دلائی۔

ناشتے کے بعد ہوٹل میں کچھ دیر گھومے پھرے تو ہم پر انکشاف ہوا کہ جس لڑکے نے ہمیں اتر پورٹ سے ہوٹل روانہ کیا تھا وہ گوید و صاحب کا بیٹا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی ان کے فرزند تھے جو ہمیں کچن میں ناشتہ کرتے ہوئے نظر آ گئے۔ گویا اس خانہ ہمہ آفتاب است۔ یہ کاروبار پورے خاندان کی ملی بھگت سے چل رہا تھا۔ ہم نے یارخاں کی نظر سے بچا کر دم شہر کی تصویر والا ایک خوبصورت فوٹو کارڈ خریدا اور اپنی اماں کو خط لکھنے کے لیے کاؤنٹر پر کھڑے ہو گئے۔ چند لمحے بعد بھین بھینی خوشبو اور گرم گرم سانسوں نے ہمیں چونکا دیا۔ دیکھا تو ہمارے پیچھے اینا کھڑی بہت غور اور حیرت سے ہمیں چھوٹے چھوٹے حروف میں لکھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس نے گوید و صاحب سے کچھ کہا اور وہ بھی آکر بغور ہماری تحریر کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ہم حیران کہ ماجرا کیا ہے۔ آخر انھوں نے مہر سکوت کو توڑا اور پوچھا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا نصویری بننا ہے؟“

ہم نے کہا۔

”لکھ رہے ہیں۔ یہ اردو ہے۔“

”اردو“ وہ حیران ہو کر بولے۔

”یہ کوئی زبان ہے؟“

ہم نے بتایا کہ یہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔ پوچھنے لگے۔

کافی پی کر شکر ادا کیا۔ پیسوں کی نقد ادائیگی کا سوال ہی نہیں تھا اس لیے ہم مطمئن تھے۔ مستقبل میں کیا پیش آنے والا ہے؟ اس کی فکر ہی ہم نے چھوڑ دی تھی اور اللہ پر توکل کر بیٹھے تھے۔ شام کو پھر ہوا خوری کو نکل گئے۔ دیکھا کہ رات کے آٹھ نو بج گئے مگر چاروں طرف روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ سڑکوں دوکانوں اور مکانوں کی روشنیاں بھی جل گئیں۔ یہ ہمارے لیے پہلا اور انوکھا تجربہ تھا، یورپ میں رات کا اندھیرا جیسے ہم جھٹ پٹا کتے ہیں، بہت تاخیر سے پھیلتا ہے۔ روشنی نو ساڑھے نو بجے تک پھیلی رہتی ہے۔ انگریزی کے لفظ (Twilight) کا مطلب یہ روشنی دیکھ کر ہم پر واضح ہوا۔ یارخاں بار بار گھڑی دیکھتے اور مطلع کرتے کہ نو بج گئے ہیں، ساڑھے نو بج گئے ہیں، دس بج گئے ہیں مگر رات نہیں ہوتی۔ آخر خدا خدا کر کے رات ہوئی اور جگمگاتے ہوئے روم کو بجلی کی روشنیوں میں چمکتے دیکھا۔ رات گئے ہوٹل میں جا کر سو گئے۔

دوسرے دن علی الصبح ہماری آنکھ موٹر گاڑیوں کے شور اور ہارنوں کی بے تماشآ آوازیں سن کر کھل گئی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو عجب منظر تھا۔ پتلی سی سڑک پر دو روہ گاڑیاں پارک بٹھیں اور درمیانی راستے میں عین ہوٹل کے سامنے ایک دودھ کا ٹرک اور ایک کار آئنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے عقب میں دونوں طرف گاڑیوں کی ایک انتہائی لمبی قطار کھڑی تھی اور سڑک پر تیل دھرنے کو جگہ باقی نہیں تھی ہر شخص ہارن بجا رہا تھا لیکن ٹرک ڈرائیور اور کار والا ان سے بے خبر ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ غلطی دراصل کس کی ہے؟ وہ دونوں زور زور سے ہاتھ ہٹا ہٹا کر نمبر آوازیں ایک دوسرے پر چیخ رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گزشتہ روز ہم جس بارے میں سوچ رہے تھے وہ ہونی ہو کر رہ گئی تھی۔ پتلی سی گزرگاہ پر بیک وقت آئے سامنے سے آنے والی دو

”آپ کے ہاں حروف تہجی ہوتے ہیں یا چینی جاپانی کی طرح تصویریں بناتے ہیں؟“

ہم نے بتایا کہ یہ حروف ہیں اور ہماری تحریر دایتس سے بائیں جانب لکھی جاتی ہے۔ انھوں نے یہ معلومات اپنا کو فراہم کر دیں۔ اس اثناء میں جینا بھی آگئی تھی اور دونوں جھجک جھجک کر باری باری ہماری تحریر کو اور ہمیں دیکھ رہی تھیں اور ہم اچھے خاصے مناشی چیز بن کر رہ گئے تھے۔ یار خاں بھی گلی میں بچوں کی لڑائیاں اور عورتوں کے جھگڑے دیکھنے کے بعد ہمارے پاس آگئے تھے۔ کہنے لگے۔

”یار بہت استاد ہو۔ لڑکیوں کو متوجہ کرنے کی ترکیب اچھی سوچی ہے تم نے۔“

گویدو صاحب نے اپنا اور جینا سے کانفرنس کی اور کہنے لگے۔

”آپ کو اعتراض نہ ہو تو یہ دونوں لڑکیاں آپ کو لکھتے ہوئے دیکھنا

چاہتی ہیں۔“

”لو، بن گئے راجہ اندر“ یار خاں جل کر بولے۔

ہم نے ان کے طنز پر کان دھرے بغیر ہی باقی ماندہ خط لکھنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی لڑکیوں کو اردو زبان کی باریکیاں بھی سمجھاتے رہے۔ وہ بڑی حیرانی سے ہمیں انتہائی تیزی سے چھوٹے چھوٹے، گول گول الفاظ ایک سیدھی لکیر میں لکھتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور ہماری کاریگری پر عیش عیش کر رہی تھیں۔ بعد میں انھوں نے ہنسل میں آنے والے اور بھی لوگوں کو ہمارے بارے میں بتایا اور وہ بھی ہماری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں ایک دوسرے کو اشارے کرتے رہے۔ دوسرا دن پھر روم اور نواجی علاقوں کی سیر کے لیے وقف تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ہم ایک بھی ایرا خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے ان ہی جگہوں پر گئے جہاں پیدل جاسکتے تھے اور جہاں جانے کے لیے

ٹکٹ نہیں خریدنا پڑتا تھا۔ وہ سارا دن بھی ہم نے گھومنے پھرنے میں گزارا مگر اس پلازا کا رخ نہیں کیا جہاں ہمالا سپانری مصالح بے چینی سے منتظر رہا ہوگا۔

روم میں یہ موسم گرما تھا۔ روم والے موسم گرما بھی عجیب طرح مناتے ہیں۔ گرمی ان کے ہاں اتنی ہی تھی جتنی لاہور میں اکتوبر کے آخری دنوں میں ہوتی ہے۔ کمروں اور ساتے میں موسم خوشگوار بلکہ مزیدار تھا۔ پٹکھے یا اتر کندیشڈ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ البتہ دھوپ تیز تھی اور کچھ دیر بھی دھوپ میں رہنا ناگوار گزرتا تھا۔ مٹا کہ روم میں موسم سرما میں برت نہیں پڑتی مگر سردی خاصی ہوتی ہے۔ گرمی میں یہاں کے لوگوں کا دن دیر سے شروع ہوتا ہے۔ دفاتر بھی نو دس بجے سے پہلے نہیں کھلتے۔ ہوٹل اور ریسٹوران تو خیر کھلتے ہی دس گیارہ بجے ہیں کیونکہ رات کو تین چار بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ دفاتر کا یہ طریقہ ہے کہ نو دس بجے کھلے اور بارہ بجے بند ہو گئے۔ یہ روم والوں کا قیلولہ کا وقت ہے۔ بارہ بجے دن کو بازار یہاں تک کہ ریسٹوران بھی بند ہو جاتے ہیں اور تین چار بجے سے پہلے دوبارہ نہیں کھلتے۔ دوپہر کے وقت روم کے لوگ کھانا وغیرہ کھا کر آرام کرتے ہیں۔ چنانچہ چار پانچ بجے تک کھانا پینا تو کیا دواؤں اور بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ اکاؤنٹا دوکانیں کھلی ہوتی ہیں۔ مگر شہر میں خاصا ہنگامہ اور رونق رہتی ہے۔ سیاحوں کی بھی اور مقامی لوگوں کی بھی۔ فٹ پاتھوں پر جگہ جگہ بوتھ بنے ہوئے ہیں جن میں ٹیلی فون لگے ہوتے ہیں۔ یہ پولیس کو اطلاع دینے کے لیے ہیں۔ اگر ہنگامی حالت میں پولیس کی خدمات درکار ہوں تو فون اٹھا کر بات کیجئے اور پولیس چند لمحوں میں سائرن بجاتی ہوئی آجاتے گی۔ یوں بھی پولیس والے پیدل اور پولیس کاروں میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ اٹلی کو ایک زمانے میں بدنام زمانہ ”مافیا“ کا ہیڈ کوارٹر کہا جاتا تھا۔ آج بھی یہ بین الاقوامی جرائم کا بہت بڑا گڑھ ہے۔ بڑے بڑے طاقت ور جرائم پیشہ گروہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ مگر عام شہریوں کی

زیادہ احتیاط سے بنا سنوار کر رکھا گیا ہے۔ جبکہ اٹلی میں صرف وہی عمارتیں زیادہ اچھی حالت میں نظر آئیں گی جو کمرشل مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہیں یا جہاں بازار اور شاہجگہ پلازا وغیرہ بن گئے ہیں۔

اگلی بار ہم روم گئے تو دیکھا کہ وہاں زیر زمین ریلوے زیر تعمیر ہے۔ بتایا گیا کہ چند میل ریلوے بن چکی ہے اور زیر استعمال بھی ہے۔ ہم نے دوسرے ملکوں کی انڈر گراؤنڈ میں بھی سفر کیا تھا۔ سوچا روم کی انڈر گراؤنڈ کا مزہ بھی چکھ لیں۔ ٹکٹ خرید کر اندر گئے تو مقابلاً صفائی کی حالت خاصی خراب تھی۔ سنگ مرمر کا فرش تھا، مگر میلا کچلا۔ ڈبے بھی زیادہ اچھی حالت میں نہیں تھے۔ صفائی وغیرہ کا یہ معیار روم میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ ہمارے مقابلے میں تو روم کو آئینہ خانہ کہہ سکتے ہیں لیکن یورپ اور امریکہ کے دوسرے شہروں سے مقابلہ کیجئے تو خاصی مایوسی ہوتی ہے۔ پھر انڈر گراؤنڈ ٹرین بنانے میں ابھیں مشکل بھی زیادہ پیش آئی کیونکہ بالائے سطح عمارتیں بہت پرانی اور بوسیدہ ہیں۔

رات کو ہم پھر واپس ہوٹل میں پناہ گزین ہو گئے۔ ریسٹوران میں پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کچھ دیر روم کی پُراسرار گلیوں کی سیر کی اور پھر سونے کے ارادے سے اپنے کمرے میں چلے گئے حالانکہ گوید صاحب اور ان کے بیٹے بار بار اصرار کرتے رہے کہ چلتے۔ نائٹ کلب لے چلتے ہیں۔ بہت اچھا ہے۔ انھوں نے نائٹ کلب کی ایسی تصویر کشی کی کہ یار خاں تو بے چین ہو گئے اور ہمارے دل میں بھی گدگدی ہونے لگی مگر مالی حالات راہ میں دیوار بنے کھڑے تھے۔ شاید گوید اور ان کے اہل خاندان کسی نائٹ کلب میں بھی حصہ دار ہوں گے تبھی تو ہماری جان کھا رہے تھے۔ ہم نے پی آئی اے کے دفتر میں فون کر کے اپنے ہوٹل کا نمبر بتا دیا تھا اور درخواست کی تھی کہ کراچی سے آنے والوں کو ہمارے بارے میں اطلاع دے دی جلتے۔

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ اگر انسان صبر کرے تو پھر کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ ہم

زندگی خاصی پُر سکون ہے اور چوری چکاری بھی زیادہ نہیں ہے۔ اگرچہ طبیعت، مزاج اور اطوار کے لحاظ سے یہ بیجا پیوں سے مشابہ ہیں مگر فرق یہ ہے کہ لڑائی جھگڑا زیادہ تر زبانی شور و غل تک ہی محدود رہتا ہے عموماً ہاتھ پائی کی ٹوٹ نہیں آتی۔ ہماری طرح چاقو چھریاں اور سپتول بھی نہیں چلتے۔ اٹلی کے کھانے سارے یورپ اور امریکہ میں مشہور ہیں۔ بعد میں روم گئے تو ہم نے بھی چھٹے مگر ہمارے ذوق کے مطابق نہیں تھے۔ البتہ کچھ کھانے خاصے لذیذ اور چٹ پٹے ہوتے ہیں۔ سادہ چاول کافی شوق سے کھاتے جاتے ہیں۔ بعض ڈبشوں میں سادہ چاول کے ساتھ شوربے والے سالن بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ہمیں تو یہی پسند آتے۔ اٹلی کی عورتوں کے متعلق ہالی وڈ کی فلموں نے ہمیں جو تاثر دیا تھا وہ درست ثابت نہیں ہوا۔ صُن یہاں کافی ہے۔ صحت مند، مناسب جسم، دراز قد، سیاہ بال، سیاہ آنکھیں، چہرے کا رنگ یورپ والوں کی طرح سفید نہیں ہوتا بلکہ اس میں ملاحظت ہوتی ہے۔ بعض کھلتے ہوتے سانولے ہوتے ہیں۔ مگر ہم نے وہاں عورتوں کے مقابلے میں مرد زیادہ خوبصورت پاتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا کی عورتیں اٹلی کے مردوں پر لوٹ لوٹ ہو جاتی ہیں۔ یہ باتونی اور چرب زبان بھی ہوتے ہیں۔ یہاں کی خواتین ایک خاص عمر تک تڑپتی رہتی ہیں مگر نوجوانی کی عمر سے گزرتے ہی موٹاپے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ ان کے مرغن اور لذیذ کھانے بھی ہیں اور پھر خوراک بھی ماشاء اللہ کم نہیں ہوتی۔

ویسے تو اٹلی اور روم اپنے عجائبات اور قدیم نوادری کی وجہ سے مشہور ہے مگر ایمان کی پوچھتے تو متعدد دوسرے چند عمارتوں کو چھوڑ کر ہمیں اکثر خاصی بوسیدہ اور شکستہ حالت میں نظر آئیں۔ زیادہ تر تو کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہیں جنھیں حکومت نے بھی جوں کا توں چھوڑ دیا ہے۔ اس کے باوجود زمانے بھر کے لوگ یہ کھنڈر دیکھ دیکھ کر ہی جی خوش کر لیتے ہیں۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں تاریخی عمارتوں وغیرہ کو نسبتاً بہت

جنگ کر ہم نے چائے کی فرمائش کی اور جتنی دعائیں یاد تھیں پڑھنے میں مصروف ہو گئے اس دن کئی سال کے بعد ہم نے طلوع آفتاب کا منظر روم میں دیکھا۔ کیا کرتے مجبور تھے سات بجے کے قریب جعفری صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ یونٹ والوں کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔ پھر بھی وہ ایک سو ڈالر ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں اور کہا ہے کہ جیسے ہی فلائٹیٹسے پیرس آجائے۔ پی آئی اے کی فلائٹیٹ اگلے دو روز تک نہیں تھی۔ نہ ہی بین امریکن میں کوئی گنجائش تھی۔ مگر جعفری صاحب نے دن کے ایک بجے کی فلائٹیٹ سے سوئس اتریں ہماری سیٹوں کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہم نے انھیں بے شمار دعائیں دیں۔ پھر کہا کہ ہمارے پاس تو نہ ہوٹل کا بل ادا کرنے کو پیسے ہیں اور نہ ہی ٹیکسی کا کرایہ ہے۔ یہاں گرووی پڑے ہوئے ہیں۔ اتر پورٹ تک کیسے آئیں؟ جعفری صاحب واقعی فرشتہ ثابت ہوئے۔ انھوں نے کہا۔

”ہوٹل والوں سے آپ میری بات کر دیجئے اور بل بنا کر یہاں لے آئیے۔ ٹیکسی کا کرایہ بھی اتر پورٹ آکر دے دینا۔ میں باہر آپ کا منتظر ہوں۔“

گویدو صاحب کو پی آئی اے پر پورا بھروسہ تھا۔ ۴۲ ڈالر کا بل انھوں نے ہمارے حوالے کیا اور ٹیکسی بھی منگوا دی۔ پتہ چلا کہ جاتے ہوئے سائرس چار ہزار لیرا کرایہ ہو گا کیونکہ وہاں سے ٹیکسی خالی آتی ہے اور اتر پورٹ ٹیکس بھی دینا پڑتا ہے۔ ہم نے حیران ہو کر کہا۔

”اتر پورٹ سے ٹیکسی خالی کیسے آتی ہے؟“

وہ بولے۔

”آپ نہیں سمجھیں گے۔ یہ روم ہے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔“

بحث کرنے کا نہ وقت تھا نہ گنجائش۔ چنانچہ خون کے گھونٹ پی کر مان گئے۔ انھوں نے بڑے جوش و خروش سے جذباتی انداز میں، میں خدا حافظ کہا اور وغیرہ

نے بھی حالات کے پیش نظر صبر کی سہل سینے پر رکھ لی تھی چنانچہ بے فکر تھے۔ آرام سے سکون کی نیند سو گئے۔ رات کو (یعنی صبح کو) پانچ بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی نے ہمیں جگایا۔ دوسری طرف فلم کے اسٹنٹ ڈائریکٹر قدیر ملک صاحب تھے۔ وہ بہت جلدی میں تھے۔ انھوں نے ہمیں شارٹ ہینڈ میں اطلاع دی کہ اب شوٹنگ کا پروگرام تبدیل ہو گیا ہے۔ راشد صاحب وغیرہ پیرس میں ہیں اور فلم یونٹ بھی براہ راست پیرس جا رہا ہے۔ ہماری نیند اور ہاتھوں کے طوطے بیک وقت اڑ گئے۔ فوراً اٹھ گئے اور ان سے کہا کہ بھائی ہمیں کس کے حوالے کیے جا رہے ہو؟ ہمارے پاس تو پیسے بالکل نہیں ہیں۔ وہ بولے۔

”آفاقی صاحب فلائٹیٹ کا اعلان ہو رہا ہے۔ میں تو جا رہا ہوں۔“

ہم نے کہا۔

”خدا کے لیے ہمارا کوئی بندوبست کر کے جھاڑ اور پی آئی اے والوں سے بات

کرادو۔“

انھوں نے انراہ کرم پی آئی اے کے میجر صاحب سے بات کرادی۔ ہم نے ان سے کہا کہ خدارا ہم مصیبت زدوں کا کچھ کیجئے۔ اس یونٹ کو روک لیجئے۔ ان کا ٹکٹ کنسل کر دیجئے ورنہ ہم بے سہارا رہ جائیں گے۔ کوئی جعفری صاحب تھے۔ انھوں نے تسلی دی اور کہا۔

”میں آپ کو فلائٹیٹ کے بعد فون کروں گا“

اور فون بند ہو گیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے۔ ہماری گفتگو اُن دونوں نے بھی سُن لی تھی اور ان کے چہروں پر بھی ہوا تیاں اُڑ رہی تھیں۔ یارخان بولے ”یار۔ یہ تو بہت ظلم ہے۔ گتا ہے ہمیں تو سچ بیچ یہاں پلٹیں دھونی پڑیں گی۔“ دل بہلانے کو ہم نیچے لابی میں چلے گئے۔ گویدو صاحب ادنگھ رہے تھے۔ انھیں

لیا کہ آئندہ کبھی اچھے حالات میں روم آتے تو اُن ہی کے مہمان ہوں گے۔
 اترپورٹ پر جعفری صاحب سوڈا رلیے ہمارے منتظر تھے۔ ٹیکسی کا کرایہ اور
 ہٹل کا بل ادا کرنے کے بعد جو ڈالر بچے وہ انھوں نے ہمارے حوالے کر دیئے اور پھر
 جہاز کی روانگی تک ہمارے ساتھ گپ شپ لگاتے رہے۔

روم کا تجربہ روح فرسا ضرور تھا مگر ہم نے خاص اطف اٹھایا تھا۔ پیرس جانے کے
 تصور سے ہماری ساری پریشانی اور کوفت دور ہو چکی تھی۔ یارخاں نے ہوائی جہاز کا بخور جاتا
 لیا اور بولے ”دیکھنے میں تو یہ بھی دیکھا ہی جہاز ہے۔ عملے کے لوگ ویسے ہی گورے چٹے
 ہیں۔ یار، میں نے نوٹ کیا ہے کہ ہر ملک کے گورے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ
 دوسروں کو کنفیوز کرنے کے لیے مختلف ملکوں کے نام رکھ لیے ہیں۔“
 ہم چپ رہے تو کہنے لگے۔

”یار۔ مزہ ای آجاتے جو سوئس اتر کا یہ ہوائی جہاز غلطی سے ہمیں لے کر سوئزرلینڈ
 چلا جاتے۔“

ہم نے انھیں یاد دلایا کہ ہمارے پاس چالیں ڈالر بھی موجود نہیں ہیں اور سوئزرلینڈ
 میں کسی جعفری صاحب کے ملنے کا امکان بھی مفقود ہے۔ یہ سن کر انھوں نے ہیل
 بہت ڈانٹا۔ بولے۔

”یار کیسے مسلمان ہو؟ خدا کی ذات پر بھروسہ نہیں کرتے؟ اسے جو خدا ہیں سوئزرلینڈ
 لے کر جاتے گا کیادہ اپنی قدرت سے ہمارے لیے وہاں ایک عدد جعفری صاحب پر
 نہیں کر سکتا؟“

جب ہم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تو انھوں نے ہم سے مایوس ہو کر برابر میں بیٹھی ہوتی
 انگریز لڑکی سے باتیں شروع کر دیں۔ ہمارے پوچھنے پر بولے ”یہ آسٹریا کی ہے۔ انگریزی مجھ
 بھی کم جانتی ہے۔ تم چپ رہو۔ میں ذرا اپنی انگریزی ٹھیک کر رہا ہوں۔“

پیرس جو ایک شہر ہے...

تاریخ کے ایک سُہری باب سے نکل کر ہم دوسرے باب میں داخل ہو رہے
 تھے۔ یارخاں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”یوں سمجھو کہ آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹکے۔“

مشہور زمانہ پیرس کو فرانس کے لوگ پیری کہتے ہیں۔ یہ بات ہمیں پیرس پہنچ کر
 معلوم ہوتی۔ ”ایس“ کی جگہ فرانس والے ”ژ“ کی آواز نکالتے ہیں اور اکثر تو اسے
 غائب ہی کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی فرانسیسی میں ”ژ“ کچھ زیادہ ہی مقبول ہے اور ان کی
 باہمی گفتگو میں ٹرول ٹراں قسم کی آوازیں کثرت سے سُنانی دیتی ہیں۔ یہ زبان
 بے حد شیریں، ملائم اور شائستہ ہے۔ پھر ان کے بولنے کا انداز، سونے پر سہاگہ چلنے
 ایک لحظہ بھی پتلے نہ پڑ رہا ہو مگر

سہ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

پیرس کا اترپورٹ دیکھ کر ہم روم سے بھی زیادہ حیران ہوئے۔ اگر وہ سیر
 تھا۔ تو یہ سوا سیر۔ خوبصورتی، رونق، صفائی اور آرائش کے لحاظ سے بھی اُس سے
 بڑھ کر اور پھر حسن و جمال اور رعنائیاں بھی یہاں زیادہ نظر آتیں۔ یہاں پہلی بار میں
 ہوائی جہاز سے باہر آنے کے لیے ایک کیسپول کے راستے اندر ہی اندر اترپورٹ

تمام یورپ کی خواتین کرتی ہیں مگر پیرس میں دیکھا کہ فرانس کی خواتین اس کاٹھنوی اہتمام کرتی ہیں۔ اور کیونکہ خواتین کی تعداد بھی کافی ہے اس لیے ہر سڑک، بازار، گلی، دوکان، سینما ہاؤس، باغ میں خوشبو کے جھونکے مسلسل آپ کے پاس سے ہو کر گزرتے رہتے ہیں اور شام جان کو معطر کرتے ہیں جس کی وجہ سے پیرس کی سڑکیں اور بازار خوشبو میں بے رہتے ہیں۔

فرانس والوں کی خوش گفتاری اپنی جگہ مگر یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی زبان کے سوا کوئی دوسری زبان بولنا کسر نشان سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر انگریزی سے تو انہیں کد ہے۔ اگر سننے والا فرانسیسی نہ جانتا ہو تو وہ ان کا منہ ہی دیکھتا رہ جاتے گا۔ پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ بعد میں ہم نے فرانس کے اور بھی سفر کیے اور وہاں آنے جانے والوں سے بھی تبادلہ خیال ہوا۔ سب کا یہی خیال ہے کہ فرانس والے زبان اور لکچر کے معاملے میں بہت متعصب ہیں۔ انگریزی تو جان بوجھ کر نہیں بولتے۔ ان کی کوشش اور خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کے ملک میں آنے والا ان کی زبان سے واقف ضرور ہو ورنہ خصالوں کھاتے۔ یعنی اپنے ریسک پر آتے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ فرانس میں دُنیا بھر سے سیاح بہت بڑی تعداد میں آتے ہیں اور ان کے لیے بہت بڑی کمائی کا ذریعہ بھی ہیں۔ لیکن فرانس کے لوگ کاروباری مصلحت کے پیش نظر بھی انگریزی سیکھنا یا بولنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اکثر یہ بھی دیکھا کہ ایک صاحب انگریزی جانتے ہیں مگر جان بوجھ کر فرانسیسی بول رہے ہیں اور جب آپ ان سے انگریزی میں مخاطب ہوتے ہیں تو شانے اُچکا کر کہہ دیتے ہیں۔ ”میخسی“! فرانس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی یوں تو سرتاپا فرانسیسی زبان سے شرابور ہونا پڑتا ہے مگر سب سے زیادہ جس لفظ سے واسطہ پڑتا ہے وہ یہی ہے۔ یعنی ”میخسی“۔ یہ دراصل انگریزی لفظ MERCY ہے جو فرانسیسی ل بھی مستعمل ہے مگر یہ لوگ ”ر“ بھی بہت مشکل سے بولتے ہیں اس لیے ”ر“ کی

کی عمارت میں پہنچنے کا موقع ملا اس کے متعلق سننے تو آتے تھے مگر دیکھنے اور استعمال کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اترپورٹ کی طویل عمارت سے گزر کر امیگریشن لائن تک جانے کے لیے پیدل گزرگاہ کے ساتھ ساتھ بجلی کے ذریعے چلنے والا ایسی میٹر (زینہ) بھی موجود تھا۔ ہمارے لیے یہ بھی ایک انوکھی چیز تھی۔ یا رھاں تو اس بجلی کی خودکار میٹر بھی پرچڑھنے کی کوشش میں گر بھی گئے مگر ان سے آگے جانے والی ایک حسینہ نے انہیں تھام لیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا سفری بیگ دُور پھینکا اور شرٹھننے لگے۔

سہ ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلاؤں۔

وہ تو خیر ہوتی کہ وہ خاتون اُردو سے نابالغ تھیں ورنہ فساد برپا ہو جاتا۔ ہم نے ایک طرف لے جا کر بارخاں کو سمجھایا کہ بھاتی۔ یہاں تو قدم قدم پر آپ کو اس قسم کے چہرے اور اس قسم کے مواقع میں گے۔ آپ اپنی شاعرانہ اور عاشقانہ حرکتوں سے باز رہیں ورنہ بلاوجہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ خود بھی نگو نہیں گے اور یہیں بھی بنائیں گے۔ وہ ایک آہ سرد دیکھنے پر کر رہ گئے۔

یوں تو روم بھی یورپ میں ہے اور ہم نے وہاں یورپ کی پہلی جھک دیکھ لی تھی مگر روم کی مغربیت میں کچھ کچھ مشرقی انداز بھی ہے۔ یوں کہتے کہ اٹلی والے پورے صاحب لوگ نہیں ہیں۔ پیرس پہنچے تو دیکھا کہ ہر چیز کچھ بڑھ چڑھ کر ہی تھی فرانس کے لوگوں کے بارے میں جیسا سُنا تھا انہیں دیا ہی پایا۔ یعنی خوش حال، خوش گفتار، خوش اخلاق اور خوش لباس۔ دوسرے ملکوں میں لوگ تن ڈھانپنے کو کپڑے پہنتے ہیں۔ مگر فرانس کے لوگ جامہ زیبی کی خاطر لباس استعمال کرتے ہیں۔ پیرس کی سڑکوں پر عام لوگ بھی خوش لباسی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوتے نظر آتے۔ اور خواتین! ان کا تو کچھ نہ پوچھتے۔ کچھ تو قدرت نے انہیں نزاکت، نفاست اور حُسن سے نوازا ہے کچھ وہ اپنی جدتِ طبع اور لطافت سے اس میں اضافہ کر لیتی ہیں۔ خوشبو کا استعمال

نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں بیرونی دنیا میں پاکستانیوں کو دوسرے غیر ملکیوں کے مساوی حیثیت دی جاتی تھی۔ بعد میں تو ہر کوئی ہم لوگوں پر شک و شبہ کرنے لگا، دیزا کی پابندیاں سخت سے سخت ہو گئیں، کسٹم دالوں نے خصوصی نظر رکھنی شروع کر دی۔ عام پاکستانیوں کے ساتھ یورپ دالوں کا سلوک بھی کچھ تحقیر آمیز اور شک و شبہ سے لبریز ہو گیا۔ مگر شروع میں ایسا نہ تھا۔ بعد میں جو بھی تاثر ہمارے بارے میں قائم کیا گیا اس میں زیادہ تر قصور ہمارا اپنا ہی ہے۔ ہم نے خود ہی اپنی حرکتوں سے دوسروں کو اپنے بارے میں خراب رائے قائم کرنے کا موقع فراہم کیا۔ وہ بھی اپنی جگہ حق بجانب ہیں۔

پیرس اترپورٹ نے ہمیں اتنا سرور کر دیا تھا کہ سارے جگے شکوے بھول کر ہم راشد صاحب اور پردیز صاحب سے بھگگیر ہو گئے۔ اترپورٹ کی عمارت سے باہر نکلے تو ایک وسیع میدان میں حدنگاہ تک کاریں کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک جانب ٹیکسیاں تھیں۔ راشد صاحب اپنی ٹیکسی میں آتے تھے جو فلم یونٹ کے لیے خاص طور پر حاصل کی گئی تھی۔ ٹیکسی کے طور پر ہم نے روم میں بھی بہت اچھی کاریں استعمال ہوتے ہوئے دیکھی تھیں مگر پیرس میں تو ہر کارنٹی، چکیلی اور قیمتی تھی۔ ہماری ٹیکسی مرستہ ریز کار تھی اور بالکل نئے ماڈل کی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا تو ساری کوفت دُور ہو گئی۔ یہ ایک حسین و جمیل، نازک اندام نوجوان خاتون تھیں جو خوشبو میں مہکی ہوتی تھیں۔ راشد صاحب نے بتایا کہ ان کا نام ”نکول“ ہے، شادی شدہ مگر اب طلاق یافتہ ہیں، دن میں ایک ٹریولنگ ایجنسی میں کام کرتی ہیں اور شام کو ٹیکسی چلاتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ بولتے راشد صاحب نے فوراً اُردو میں ہمیں مطلع کیا کہ ہوشیار۔ یہ انگریزی بھی جانتی ہیں۔ دراصل ان کی انگریزی دانی کی بنا پر ہی راشد صاحب نے دورانِ قیام مستقل طور پر ان کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ نکول کی وجہ سے بہت سے کام آسان ہو گئے۔ وہ

جگہ ”خ“ کی آواز نکلتی ہے چنانچہ مرسی تبدیل ہو کر مینچی ہو گیا ہے۔ یہ لفظ کئی مصلوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی انگریزی کے ایکسیوزنی کی جگہ بھی یہی، معاف کیجئے کی جگہ بھی یہی، سواری کی جگہ بھی یہی، مجھے نہیں معلوم کی جگہ بھی یہی زحمت فرمائیے کی جگہ بھی یہی غرضیکہ اس کے معنی بے شمار ہیں۔ فرانس والے اس لفظ کو اتنی خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ فارسی کی مانند فرانسیسی بھی میٹھی اور شائستہ زبان ہے اور جدید فارسی کی طرح اس زبان کی ادائیگی اور لب و لہجہ بھی انتہائی شیریں اور ملائم ہے۔ ہمارا تو یہ عالم تھا کہ دو خواتین یا مرد آپس میں بحث کر رہے ہیں با جھگڑ رہے ہیں اور ہم کھڑے سُن رہے ہیں اور لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ عام طور پر لوگ نرم اور دھیمی آواز میں گفتگو کرتے ہیں۔ اکثر تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سرگوشی میں راز و نیاز کر رہے ہیں مگر یہ ان کا مخصوص انداز ہے۔ کاروبار کی گفتگو بھی اسی انداز میں کی جاتی ہے۔

خیر۔ یہ تو برسِ بیل مذکرہ تھا۔ پیرس کے اورلی اترپورٹ کی عمارت میں امیگریشن کے مرحلے سے گزر کر ہم اترپورٹ کی طویل و عریض اور عالیشان عمارت میں پہنچے تو سامنے کھڑے راشد مختار صاحب اور پردیز ملک صاحب کو دیکھ کر جان میں جان آگ کسٹم دالوں نے بھی ہمارے ساتھ بہت خلوص اور شفقت کا برتاؤ کیا تھا۔ دراصل اُس زمانے میں دنیا زیادہ پرسکون اور بااخلاق جگہ تھی۔ دیزا کی سختیاں بھی زیادہ نہیں تھیں، نہ ہی کسٹم والے یوں کھڑتے تھے جیسے کچا ہی چبا جائیں گے۔ پاکستانیوں کے ساتھ اس وقت تک امتیازی سلوک بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک ہمارے اہل وطن نے بہت بڑی تعداد میں ملک سے باہر جانا شروع نہیں کیا۔ اس لیے غیروں کو شکایت کا موقعہ بھی نہیں ملا تھا۔ سگنگنگ میں ہم پاکستانیوں نے بدنام زمانہ حیثیت بعد میں حاصل کی اُس وقت تک اس میدان میں بھی ہماری شہر

سے انڈر گراؤنڈ ٹرین گزرتی ہے۔ اب تو انگلش چینل کے اندر ہی اندر انھوں نے انگلستان اور فرانس کو ملانے کے لیے سڑک اور ٹرین بھی بنادی ہے۔ لندن میں بھی ہم نے دیکھا کہ قریب قریب ہر عمارت کتی کتی سو فٹ تک زمین کے اندر ہے۔ پھر ٹرینوں کا بھی ایک جال بچھا ہوا ہے۔ گویا شہر بالکل کھوکھلا ہے مگر بے انتہا مضبوط اور پائیدار۔ پھر ہمیں خیال آیا کہ ہم نے بھی کراچی اور لاہور میں سڑکوں پر ایک دو مقام پر چند فٹ طویل انڈر گراؤنڈ راستے بنانے کی کوشش کی تھی جو سالہا سال تک زیر تعمیر رہے۔ بعد میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے یا گندگی اور غلاظت کا ڈھیر بن گئے اور استعمال کے قابل نہیں رہے۔ دُنیا بھر میں اورور ہیڈ سڑکیں پُلی اور راستے ہر بڑے شہر میں بن گئے ہیں۔ سڑکوں میں ہم نے قاہرہ میں بھی ایسے راستے دیکھے تھے۔ بنیادی طور پر یہ طریقہ کامستہ حل کرنے کے مقصد سے بنائے جاتے ہیں لیکن شہروں کی خوبصورتی اور زیبائش میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ٹریفک اور آبادی کا حجم ہمارے ملک میں بھی ہے مگر آج تک پاکستان کے کسی ایک شہر میں بھی اورور ہیڈ برج یا سڑکیں نہیں ہیں۔ حالانکہ دوسرے کئی ترقی پذیر اور غریب ملکوں کے شہروں میں بھی یہ موجود ہیں۔

ہم پیرس کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہوٹل کی طرف جا رہے تھے اور شہر کے مناظر، درودیوار اور باغات کو دیکھ دیکھ کر حیران اور مسرور ہو رہے تھے۔ پیرس میں ایک عجیب فرحت بخش اور دل خوش کُن احساس ہوتا ہے۔ یہ شہر آنے والوں کو مسحور کر لیتا ہے۔ کم از کم ہمارے ساتھ تو یہی واردات گزری۔ ہم نے اس کے بعد بے شمار ملکوں کے سفر کیے درجنوں شہر دیکھے مگر جو حُسن، خوبصورتی، دکشی اور انوکھا پن پیرس میں پایا وہ کہیں اور نظر نہ آیا۔ شاید اسی لیے یہ کہادت مشہور ہے کہ دُنیا میں ہر شخص کے دو وطن ہوتے ہیں۔ ایک اس کا آبائی وطن اور دوسرا پیرس۔ واقعی اس شہر میں پہنچ کر بہت اپنائیت اور گرمجوشی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ آنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ بعد میں ہم نے پیرس اور

پیرس، مقامی طور پر لیتون، مقامات اور دفتری کارروائیوں سے بخوبی واقف تھیں ان کی وجہ سے بہت سی مشکلیں آسان ہو گئی تھیں۔ ورتہ پیرس میں کسی دفتر میں جا کر حوالہ سنانا آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی انگریزی سمجھنے والا ہی دستیاب نہیں ہوتا۔ ٹیکس سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ انھوں نے سہری زلفوں کو جھٹکا دیا اور اپنا خوشبو ہاتھ مصافحے کی خاطر ہماری طرف بڑھایا۔ پھر بتایا کہ انھوں نے پاکستان بھی دیکھا۔ اور لاہور میں بھی قیام کیا ہے۔ لاہور کی وہ بہت مداح نکلیں۔ خاص طور پر یہاں۔ پاکستانی کھانوں نے ان کا دل موہ لیا تھا۔ اگرچہ زیادہ مروجوں سے شاکی تھیں مگر شیراز کے کھانے کا لطف وہ نہیں بھول سکی تھیں۔ لیجئے ان کے اور ہمارے درمیان ایک تعلق بھی نکل آیا۔ بعد میں یہ دستور رہا کہ ہم ان سے پیرس کی تعریفیں کرتے رہے اور لاہور کے کُن گاتی رہیں۔ اس طرح حساب برابر ہو گیا۔

پیرس کا اولی اتر پورٹ بھی شہر سے کافی دُور ہے۔ بعد میں وہاں ڈیگال اتر پور بھی بن گیا جو اولی سے زیادہ خوشنما اور شاندار ہے۔ اگلے سفر پر ہم ڈیگال اتر پور پر بھی پہنچے تھے۔ اتر پورٹ سے نکلتے ہی ہم نے دیکھا کہ ہم جس سڑک پر جا رہے ہیں ا کے اوپر ایک ہوائی جہاز لینڈ کر رہا ہے۔ سڑکوں پر سڑکیں تو ہم روم میں بھی دیکھ چکے مگر سڑک پر ہوائی جہاز لینڈ کرنے کا تماشہ پیرس ہی میں دیکھا۔ جگہ اور گنجائش کی کو وجہ سے یورپ والوں نے یہ سب طریقے نکالے ہیں کہ جہاں ایک سڑک بن سکتی تھی وہاں دو پر تکتے کئی سڑکوں کا جال بچھا دیا ہے۔ چنانچہ سڑکیں بھی کئی کئی منزلہ ہیں۔ زمین اندر بھی انھوں نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ سڑکیں کھود کر ان میں سڑکیں بنادی ہیں۔ انڈر گراؤنڈ ٹرینوں کے علاوہ سارے یورپ میں زیر زمین ایک الگ دُنیا آباد ہے۔ عمارتوں کی کئی کئی منزلیں، دفاتر، دوکانیں، کار پارکنگ، سینما گھر، کمرشل پلازا، جانے کیا کیا زمین کے اندر کئی کئی منزل گہرا چلا گیا ہے۔ لندن میں دریائے ٹیمز کے نیچے

فرانس میں بہت کچھ دیکھا مگر پہلا ہی تاثر حواس باختہ کر دینے والا تھا۔ روم کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ صاف ستھرا اور آراستہ شہر ہے۔ ٹیکسی سے گزرتے ہوئے جتنا کچھ دیکھ پاتے اس نے احساس دلا دیا کہ اس شہر کی شان، نظم و ضبط، صفائی، خوبصورتی اور چمک دمک قابل دید ہے۔ اس کے مقابلے میں روم خاصا گندہ اور پُرانا پُرانا سا لگا بڑھیک کی پیرس میں بھی بہتات تھی۔ بعض سڑکوں پر پانچ پانچ ایک طرفہ قطاروں میں دو دروہ ٹریفک رواں تھا لیکن انتہائی نظم کے تحت روم والی افراتفری موجود نہیں تھی۔ ہارن کا شور بھی نہیں تھا۔ کسی اور قسم کے شور و غل کا تو سوال ہی نہیں۔ عمارتیں ایسی چمکیلی، نکھری نکھری کہ سب دیکھتے ہی رہو۔ پیرس میں بھی قدیم طرز تعمیر اور قدیم عمارتوں کو برقرار رکھا گیا ہے۔ کہنے کو یہ بھی ایک پُرانا شہر ہے مگر شہر کا کوئی بھی حصہ دیکھ لیجئے۔ کیا خیال جو پُرانے پن یا بوسیدگی کا احساس ہو جاتے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی بالکل نیا تعمیر ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انگریزوں (اور دوسروں) کے برعکس فرانس کے لوگ اپنے شہروں (اور دیہاتوں) کی عمارتوں پر باقاعدگی سے رنگ دروغن کرتے رہتے ہیں اور ہر چیز کو چمکا کر رکھتے ہیں۔ سڑکیں، بازار، عمارتیں، چوراہے، قدیم گرجا گھر جیسے جس چیز کو دیکھتے آتے ہیں کے موافق چمکتی ہوئی، اکثر سڑکیں پتھروں سے بنی ہوئی ہیں۔ یعنی پتھروں کے یکساں اور ہموار ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہیں مگر اس قدر خوبصورت اور ہموار کہ سفر کرنے میں لطف آ جاتا ہے۔ ذرا سا بھی جھٹکا محسوس نہیں ہوتا اور ٹریفک یوں لگتا ہے جیسے پانی میں تیرتا ہوا گزر رہا ہے۔ پیرس کی سڑکوں پر دو دروہ درختوں کا خصوصی اہتمام ہے اور درخت بھی یکساں فاصلے پر ایک ہی سائز میں ترشہ ہوتے (ہمارے لاہور میں تو اچھے خاصے درختوں کو خصوصی طور پر کاٹ دیا گیا ہے) اور ان کی آبیاری یہاں تک کہ ان کو دھونے اور نہلانے کا بھی باقاعدہ انتظام ہے جس کی وجہ سے یہ درخت اور ان کے پتے ایسے سبز اور تردنازہ لگتے ہیں جیسے

غسل کے بعد کوئی حیدنہ۔ درختوں کو نہلانے کا یا قاعدگی سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ سڑکوں کی ہر روز دھلائی بھی ہم نے پیرس ہی میں ہوتے ہوئے دیکھی۔ ہم نے سنا تھا کہ پیرس میں شیشے کی سڑکیں ہوتی ہیں۔ دراصل سڑکیں تو سیمنٹ، پتھر اور تارکول ہی کی ہوتی ہیں مگر دیکھ بھال کی وجہ سے ہر دم چمکتی نظر آتی ہیں۔ شاید اس لیے یہ تاثر عام ہو گیا ہو۔ شہر کی خوبصورتی، صفائی اور دلکش محض حکومت یا کارپوریشن کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ شہری بھی اس کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ پیرس والوں کو اپنے شہر پر ناز ہے اور وہ اس کی تعریف و ثناء کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ تعریف و توصیف ہم بھی اپنے شہروں کی بہت کرتے ہیں۔ ان سے محبت بھی کرتے ہیں مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتے۔ لاہور والے اپنے شہر پر بجا طور پر ناز کرتے ہیں مگر اس شہر کی خوبصورتی اور صفائی کی خاطر وہ اُنکی تک ہلانا پسند نہیں کرتے۔ ہاں، اعتراض ہر طرح کے سُن لیجئے مگر گھروں کی گندگی اور کوڑا کرکٹ ہر کوئی دروازے کے باہر ہی پھینکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے شہروں کے لوگ اپنے شہروں کی نگہداشت بھی کرتے ہیں اور انھیں صاف ستھرا اور خوبصورت رکھنے میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ پیرس والوں کی نفاسست اور احساس ذمہ دار کا اندازہ یوں لگائیے کہ ہمارے قیام کے زمانے میں ایک اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ایک صاحب نے بلدیہ کو فون کر کے بہت ڈانٹا کہ میرے درخت کو دو دن سے غسل نہیں دیا گیا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ ان کے فلائینٹ کے سامنے والا درخت، جسے وہ اپنا ذاتی درخت تصور کرتے تھے کسی ناگزیر وجہ کی بناء پر ایک دن اسے دھویا نہیں گیا تو انھوں نے سارا شہر سرپڑاٹھالیا۔ فخر تو روم والے بھی اپنے شہر پر بہت کرتے ہیں مگر شہر کے چپے چپے اور ذرے ذرے سے دیوانگی کی حد تک محبت، فخر و انبساط اور اس کی دیکھ بھال کا جو جذبہ ہم نے پیرس والوں میں دیکھا وہ کہیں اور نہیں پایا۔

زندگی بالکل ٹھپ ہو کر رہ جاتیں۔ ہوٹل کی مالکہ میڈم کارلونے کھڑے کھڑے ہی ہمارا سارا احوال پوچھ لیا اور کمرے کی چابی ہمارے حوالے کرتے ہوئے پیرس کی خاص خاص باتیں اور موسم کا احوال بھی سنا دیا۔ پھر ہمدردی سے کہنے لگیں۔

”شدید اور مسلسل بارش کی وجہ سے شوٹنگ رُک رہی ہے۔ بہت نقصان ہو رہا ہے تمہارے دوستوں کا۔ مگر میری پیش گوئی سُن لو“

ہم نے کہا۔

”فرمائیے!“

بولیں۔

”تو اردو اُسُن“ (یعنی کل سورج نکلے گا)، ہم نے خوش ہو کر قلم ساز راشد مختار کی جانب دیکھا۔ وہ ہنس کر اُردو میں بولے۔

”اس جھوٹی کی باتوں پر یقین مت کرنا۔ یہ پچھلے چار دن سے ہمیں یوں ہی تسکیں دے رہی ہے“

اور واقعی اگلے تین دن بھی بارش کی نذر ہو گئے اور ہم لوگوں نے گھومنے پھرنے کے سوا اور کچھ کام نہیں کیا۔ پانچویں دن سورج نکلا تو میڈم کارلونے بڑے فاتحانہ انداز میں ہمیں دیکھا اور بولیں۔

”دیکھا۔ میں نہ کہتی تھی کہ کل سورج ضرور نکلے گا؟“

پیرس کی خوبیاں تو سبھی بیان کرتے ہیں۔ بہتر ہوا اگر ہم وہاں کی قباحتیں پہلے بیان کر دیں۔ سب سے بڑا مسئلہ تو زبان کا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یا تو ہم گونگے بہرے ہیں یا گونگے بہروں کے شہر میں آگئے ہیں۔ اقبال نے کہا کہ

عج بڑی مشکل سے ہوتا ہے چین میں دیدہ در پیدا

یہی معاملہ پیرس والوں کے ساتھ ہے کہ بڑی مشکل سے کوئی انگریزی جاننے والا ملتا ہے۔

ہوٹل پہنچے تو پیرس کی ایک جھلک دیکھ چکے تھے اور گرم مُم رہ گئے تھے۔ شہر ایسے بھی ہوتے ہیں؟ یہ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا۔ ہوٹل پہنچ کر یا رخاں اور تودہ ہم سے جُدا ہو گئے۔ دراصل ان کا شعبہ اور عکمہ علیحدہ تھا۔ اس لیے پھر قیام بھی ہم سے علیحدہ رہا۔ اس طرح ہم یا رخاں جیسے رفیق کے ساتھ سے محروم ہو گئے۔

پیرس میں فلم کا پورا یونٹ ہم سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور تین مختلف ہوٹلوں میں مقیم تھا جو اس پاس ہی تھے۔ بات یہ تھی کہ یہ سیاحوں کا موسم تھا اور ہم لوگ پیشگی اطلاع اور بکنگ کے بغیر اچانک ہی پہنچ گئے تھے اس لیے جہاں بھی جگہ ملی ٹھہر گئے۔ یورپ کے دوسرے شہروں میں بھی ہمیں اسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ جس ہوٹل میں بیشتر لوگ مقیم تھے وہ بہت بڑا تھا جب کہ راشد صاحب، پردیز صاحب اور مجھے ایک قریبی چھوٹے سے ہوٹل میں جگہ ملی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ جہاں تک ہوٹلوں کی صفاتی، سروس اور دیکھ بھال کا تعلق ہے وہ ہر ہوٹل میں یکساں ہے۔ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ چھوٹے ہوٹلوں میں عموماً مالک ہی سارے فرائض سرانجام دیا کرتے ہیں۔ اور ان میں شان و شوکت اور آرائش کے اعتبار سے کوئی کمی نہیں ہوتی۔

ہمارے ہوٹل کی مالکہ ایک گداز جسم کی ادھیڑ عمر، گوری چٹّی خاتون تھیں۔ بلکہ انھیں سُرخ و سفید کتنا زیادہ درست ہو گا۔ باتونی تو سارے ہی فرائض والے ہوتے ہیں مگر یہ کچھ زیادہ ہی باتونی تھیں اور خاصی ہنس مکھ بھی۔ انگریزی ان کی داجی ہی تھی مگر اپنی بات سمجھ اور سمجھا سکتی تھیں۔ ہم پیرس پہنچے تو مرسلا دھار بارش ہوئی تھی مگر سواتے پانی کے اس بارش میں کوئی خاص بات نہیں یعنی نہ سڑکوں پر پھیلوں کا سماں، نہ کیچڑ، نہ غلاظت، یورپ کے ملکوں میں بارش بہت کثرت سے اور عموماً اکثر ہوتی رہتی ہے مگر پانی کے نکاس کا بندوبست ایسا ہے کہ کیا مجال جو سڑک پر پانی کھڑا ہو جائے۔ ہمارے ہاں اگر اس سے نصف بارش بھی ہونے لگے تو شہر کے شہر اس میں ڈوب جاتیں اور کاروبار

پیدا ہو جاتی ہے۔ فرانسیسی میں وہ ہندسوں کو کسی اور انداز میں بولتے ہیں غرضیکہ خاصی جھک جھک رہتی ہے۔ راشد صاحب کے والدین جس بڑے ہوٹل میں مقیم تھے اس میں پانچسو سے زائد کمرے تھے اور بڑے ہوٹلوں والا سارا تام جھام موجود تھا۔ مگر انگریزی بولنے والے وہاں بھی سارے سٹاف میں مشکل سے دو تین ہی تھے۔ حد تو یہ ہے کہ ٹیلی فون آپریٹر انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتی تھی۔ یہاں تک کہ روم نمبر تک نہیں سمجھ سکتی تھی۔ ایک بار ہم اس سے نمبر مانگ رہے تھے جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے ایک نمبر ملا دیا۔ ہم نے ہیلو کہا تو دوسری جانب سے کسی نے بڑی مستطیل اور دو بلونی شروع کر دی۔ ہم تو حیران ہی رہ گئے۔ پتہ چلا دوسری جانب بھی ایک صاحب بہت دیر سے کوئی نمبر طلب کر رہے تھے جو آپریٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے دونوں انگریزی بولنے والوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔ ہم پاکستان سے چلے تو جون کا مہینہ تھا۔ گرمی اپنے جون پر تھی۔ روم میں موسم خوشگوار تھا مگر پیرس میں تو باقاعدہ سردی تھی اور ہم لوگ ہیٹر جلانے پر مجبور تھے۔ بارش نے خشکی زیادہ کر دی تھی۔ دھوپ بھی نکلی تو سردی میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوتی مگر ہم نے اُجلا اُجلا پیرس سورج کی شاخوں میں چمکتا ہوا دیکھ لیا۔ سورج نکلتے ہی یوں لگا جیسے ہر چیز بدل گئی ہو۔ سبز، عمارتیں، سڑکیں، محبت، باغات، ہر چیز نگاہوں کو خیرہ کرنے لگی۔ شانز ایلینزے گئے۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک ہی سڑک ہے سڑک تو خیر بہت کشادہ ہے ہی لیکن اس کے دونوں طرف فٹ پاتھ بھی سڑک سے کم کشادہ نہیں ہیں۔ اور پھر نہایت صاف شفاف اور خوبصورت۔ سڑکوں کے کنارے ریٹوران ہم نے روم میں بھی دیکھے تھے مگر پیرس میں اس کا رواج زیادہ ہی پایا۔ اور شانز ایلینزے کے فٹ پاتھ تو غالباً بناتے ہی اس مقصد کے لیے گئے ہیں۔ دوسرے فٹ پاتھوں پر بے شمار لوگ گھومتے پھرتے ہیں اور لب سڑک ریٹوران میں دم لینے اور

کئی بار تو اتنے زچ ہوتے کہ اُلجھن ہونے لگی۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ آپ انگریز میں کوئی پتہ پوچھیں گے تو وہ سمجھیں گے ہی نہیں۔ وجہ یہ کہ فرانسیسی زبان میں اس تلفظ کچھ اور ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایفل ٹاور بھی نہیں سمجھتے۔ شانزے لینزے پر کی مشہور عالم سڑک کا نام ہے۔ انگریزی میں یہ لفظ کسی اور طرح لکھا جاتا ہے۔ فرانسر والے اسے کسی اور انداز سے بولتے ہیں۔ آپ لاکھ دریافت کرتے رہیں کوئی ہینر بتائے گا۔ اور جودہ بتائے گا وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ چنانچہ سر پیٹنے کو جو چاہتا ہے۔ تیسری بار جب ہم اپنے اہل خانہ کے ساتھ پیرس گئے تو ہماری دوسرا بچی پارڈ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ایک دن تو وہ صبر کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھتی رہی کہ کسی ایک جگہ کا پتہ دریافت کرنے کے لیے ہم دو جوتوں بلکہ سینکڑوں آدمیوں اور عورتوں سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں اور ان میں سے ہر ایک شانے اُچکا کر اور "مخنی" کہہ کر گزر جاتا ہے۔ دوسرے دن بھی جب یہی تماشہ دیکھا تو وہ ہم سے پوچھنے لگی۔

"پاپا۔ آپ ایسی جگہ آتے ہی کیوں ہیں جہاں کوئی آپ کی بات نہیں سمجھتا؟" پارڈ اپنی جگہ صبح تھی مگر وہ یہ حقیقت جاننے کے لیے ابھی بہت کم سن تھی کہ پیرس کا دیدار کرنے کے لیے یہ پریشانی منگنا سودا نہیں ہے۔ یہ حادثہ تو اکثر پیش آیا کہ ہم دوکاندار خاتون سے مانگ کچھ رہے ہیں اور وہ دے کچھ رہی ہیں۔ ایک بار ہم نے ڈبل روٹی اور مکھن خریدنے کا ارادہ کیا۔ ڈبل روٹی تو سامنے رکھی ہوئی تھی اشارہ کرنے پر مل گئی۔ اب ہم خاتون کو ہیرا سمجھا رہے ہیں کہ ہمیں مکھن درکار ہے مگر انگریزی میں کہنے اور اشاروں سے سمجھانے کے باوجود وہ حیران ہوتی رہیں اور مختلف چیزیں لا کر ہمیں غماتی رہیں۔ ہم نے ایک ہاتھ کے اشارے سے ہتھیلی پر چھڑ سے مکھن لگانے کا اشارہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر سکر امیں اور دوڑ کر اندر سے صابن کی ٹمکیہ اٹھالیں۔ اسی طرح چھوٹی دوکانوں پر رقم کے بارے میں بھی غلطی

پیرس کے دن بھی حسین ہیں اور راتیں بھی۔ پیرس کو بجا طور پر روشنیوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہاں ایک "روشنیوں کا چوک" بھی ہے۔ یہ انتہائی وسیع و عریض چوک ہے اور بجلی کے قمعوں سے جگمگاتا رہتا ہے۔ رات کو ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ شہر کی سڑکوں پر شاہیہ کے جیسے جگہ بجگہ ایستادہ ہیں۔ بعض شہری ہیں اور ایسے چمکتے ہیں جیسے ابھی ابھی کوئی ستارہ بنا کر گیا ہے۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین کا پہلا تجربہ زندگی میں نہیں پیرس ہی میں ہوا۔ ٹرینیں بے حد سبک اور خوبصورت اور انڈر گراؤنڈ سٹیشن ان سے بھی زیادہ خوبصورت اور آراستہ۔ لوگ بھی نظم و ضبط اور شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور انتہائی رش کے اوقات میں بھی دھکم پیل نہیں ہوتی۔ کسی بھی قوم کا اندازہ شہروں کے ٹریفک اور ہوٹلوں کے غسل خانوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ پیرس کی سڑکوں کا احوال تو ہم بیان ہی کر چکے ہیں اب غسل خانوں کا تذکرہ بھی سن لیجئے۔ پیرس میں (اور تمام یورپ کے شہروں میں) جگہ جگہ غسل خانے تعمیر کیے گئے ہیں۔ یہ غسل خانے انتہائی صاف ستھرے اور آراستہ ہوتے ہیں۔ ایک تو مسلسل صفائی کا انتظام ہے، دوسرے استعمال کرنے والے بھی سلیقے اور تہذیب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہمارے آپ کے گھروں کے غسل خانے بھی ایسے نہیں ہیں جیسے وہاں کے پبلک ٹوائلٹس ہوتے ہیں۔ ہمیں ایک ریٹورنٹ کے غسل خانے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اُشادہ سیڑھیوں سے گزر کر غسل خانے میں پہنچے تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ سوچا شاید ہم غلط جگہ آگئے ہیں۔ اس قدر صاف ستھرا اور چمکدار تھا کہ دیکھتے ہی رہ گئے اور پھر خوشبو سے ہنکتا ہوا۔ باہر نکل کر دوبارہ دروازے پر لکھی ہوئی تحریر اور تصویر دیکھی تو تصدیق ہو گئی کہ واقعی غسل خانہ ہی ہے۔ بڑی احتیاط اور احترام سے ہم اندر داخل ہوئے۔ کچھ حصے میں قیمتی قالین کا فرش تھا۔ اس کے آگے سفید ٹائلز کا فرش تھا جو باقاعدہ شکارے مار رہا تھا۔ ہم پھونک پھونک قدم کر رکھتے ہوئے آگے بڑھے کہیں

تازہ دم ہونے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ زنگارنگ کے لوگ دیکھ لیجئے۔ قسم قسم کے لباس رت نئی زبائیں بولنے والے لوگ جس دروغاتی ایسی جیسے مسلسل اور مستقل فیشن پر ٹیڈ ہر رہی ہو۔ پیرس کی کسی بھی سڑک کے کنارے ریٹوران میں بیٹھ جاتے۔ سامنے کافی کی پیالی رکھ لیجئے اور گھنٹوں بیٹھے تماشہ دیکھتے۔ ایک لمحے کے لیے بھی اُگتا ہٹ نہیں ہوتی پیرس میں حسن و جمال بے اندازہ ہے۔ مگر یہاں ہمیں نسلی امتیاز مطلق نظر نہیں آیا۔ بلکہ اس کے برعکس ہم کالے مردوں کے بازو میں بازو ڈالے گھومنے والی سفید فام اور خوش جمال خواتین کو بہت حیرانی سے دیکھتے رہے۔ اسی فٹ پاتھ کے ایک ریٹوران میں ہم نے دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی کو دیکھا۔ کم از کم ہماری نظروں سے ایسی حسین و جمیل لڑکی نہ گزری تھی نہ گزری ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ کہ وہ ایک کالے کلرٹے افریقی کے ساتھ گھوم رہی تھی اور بظاہر وہ صاحب مالدار بھی نظر نہیں آتے۔ ایک اور حقیقت جو یورپ (اور امریکہ) میں ہم پر منکشف ہوتی وہ یہ تھی کہ عورتوں کی خوبصورتی اور دولت لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ مغربی معاشرے میں حسن کی کمی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بیحد عام ہے۔ ہوٹلوں میں وٹیرس، دکانوں میں سیلز گرل، دفاتروں میں کلرک جسے دیکھتے ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت اور پرکشش مگر ان کی خوبصورتی ان کی مادی خوشحالی کا سبب مطلق نہیں ہے خوبصورتی کو ہم نے وہاں ایک غیر اہم چیز پایا۔ ہمارے ملک میں ذرا سی خوش شکل لڑکی بھی غریب حسن میں مبتلا ہو جاتی ہے اور خوبصورتی کو لڑکیوں کی خوشحالی اور خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ محض خوبصورت چہرہ بہت زیادہ مراعات حاصل کر لیتا ہے۔ مگر مغرب میں ایسا نہیں ہے۔ حین ترین لڑکیاں انتہائی معمولی ملازمتیں کرتی ہیں اور خوشحال، دولت مند اور خوب صورت لڑکیاں بھی خاصے بد حال اور میلے کچیلے بد شکل لڑکوں کے ساتھ گھومتی نظر آتی ہیں ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ حُسن بہت عام ہے۔

دیں رُک کر دیکھتا رہ جاتا ہے۔ نظم و نسق اور زیبائش بھی قابلِ دید ہے۔ میوزیم نہ صرف اندر سے دیکھنے کے قابل ہیں بلکہ باہر سے بھی انتہائی دیدہ زیب اور دلکش ہیں۔ میوزیم تو ایک طرف آپ کو پیرس کی مختلف سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر بھی فنونِ لطیفہ کی نمائش نظر آجاتی ہیں۔ ملک ملک سے فن کار یہاں آکر اپنے قیام اور تربیت کے اخراجات پورے کرنے کی غرض سے جو تصاویر وغیرہ بناتے ہیں وہ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر فروخت کر دیتے ہیں۔ ان میں بڑی بڑی نادر تصاویر بھی مل جاتی ہیں۔ پھر ایسے آرٹسٹ بھی گُرسیاں اور سٹول ڈالے دکانوں کے برآمدوں میں بیٹھے مل جاتے ہیں جو ہاتھ کے ہاتھ آپ کی تصویر بنا کر آپ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہی حال مسیقاروں وغیرہ کا ہے۔ گلی گلی، سڑک سڑک موسیقار گھومتے پھرتے ہیں۔ ہٹلوں میں، ریڈیو رانوں میں اپنی موسیقی سے آپ کو شاد کام کرتے ہیں جس کا جی چاہے کچھ دے دے۔ ورنہ کوئی شکایت نہیں۔ پھر بھی یہ لوگ خاصے معقول پیسے اکٹھے کر لیتے ہیں۔ یہی عالم روم میں بھی دیکھا۔ خصوصاً اتوار کے روز وہاں موسیقار اور سازندے موٹر سائیکلوں پر گھر سے نکلتے ہیں اور ہٹل ہٹل، ریڈیو ران ریڈیو ران گھوم کر تھوڑی تھوڑی دیر میوزک سُنا کر شوقینوں سے اچھے خالصے پیسے بٹور لیتے ہیں۔ ایک بار ہم اپنی بیگم اور ایک دوست کے ساتھ روم کے ریڈیو ران میں بیٹھے تھے۔ کرنسی کی دستیابی اُن دنوں بھی مشکل تھی۔ ہم ایک ایک لیرا بڑی احتیاط سے خرچ کرتے تھے ایک اتوار کو ایک ریڈیو ران میں بیٹھے مینو کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حباب کتاب کر رہے تھے کہ کم سے کم خرچ والا لُچ کو نسا ہو سکتا ہے کہ ایک نوجوان موسیقار گٹار ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا۔ سبھی حاضرین اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اس نے اطالوی اور ڈچی پھوٹی انگریزی میں دوچار باتیں کیں اور پھر موسیقی شروع کر دی۔ جس کی میز کے اس جاتا وہ کچھ نہ کچھ اس کی نذر کر دیتا۔ بعض لوگوں نے کچھ بھی نہیں دیا مگر

پیسل ہی نہ جاتیں۔ سچ جانیے اس غسل خانے کو بطور غسل خانہ استعمال کرنے کو ہمارا بالکل جی نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری بھی کوئی چیز ہے۔ مختلف رنگوں اور ساتروں کے تولیے ہاتھ خشک کرنے کو بکلی کی گرم ہوا، سونگھنے کو خوشبو، سبھی آسائشیں موجود تھیں۔ ہیرڈنی کمرے میں دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت میز پر ایک نفرتی برتن رکھا ہوا ہے جس میں مختلف سکے پڑے ہوتے ہیں۔ غسل خانہ استعمال کرنے والے اپنی خوشی سے جو چاہیں اس برتن میں ڈال دیتے ہیں۔ نہ ڈالیں تو بھی کوئی شکوہ نہیں۔ جہاں تک غسل خانوں کا تعلق ہے یورپ کے ہوٹلوں میں ہم نے بڑے شاہانہ قسم کے غسل خانے دیکھے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کے غسل خانوں میں بھی سفید براق قالین، خوشبودار صابن، شیمپو اور سینٹ کی شیشیاں دیکھیں تو حیران رہ گئے۔ اور لطف یہ کہ ان اضافی چیزوں کی سہولتوں کا معاوضہ بھی وصول نہیں کرتے۔ مگر یہ گزرے وقتوں کی باتیں ہیں جب ہنگامی کے عہدیت نے اتنی جسامت اختیار نہیں کی تھی۔ اب تو یہ باتیں فقہ پارینہ معلوم ہوتی ہیں۔

پیرس دُنیا بھر میں آرٹ اور کچر کا گوارہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے یہ حیثیت زمانہ قدیم سے حاصل ہے۔ یوں سمجھئے کہ دُنیا بھر کا کوئی فن کار اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا جب تک وہ مشقت اور ریاضت کے کچھ دن پیرس میں نہ کاٹے۔ پیرس کے میوزیم نوعِ ہر نوع نوادر اور شاہکاروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ہم بھی میوزیم دیکھنے گئے۔ ایک مشکل تو یہ ہے کہ کوئی ایک میوزیم ہو تو کوئی دیکھ لے۔ وہاں تو درجنوں میوزیم اور عجائب گھر ہیں اور ہر ایک اتنا لمبا چوڑا کہ اس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے میں ہی دنوں، ہفتوں لگ جاتے ہیں۔ یہ اُس صورت میں ہے جب آپ ہر چیز کو محض ایک سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے گزر جاتیں۔ اگر بغور دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا ارادہ ہے تو پھر اس کے لیے مہینوں، سالوں درکار ہیں۔ ہر شاہکار ایسا کہ انسان

داد پر اکتفا کیا۔ مگر جب وہ ہماری میز کے پاس آیا تو غریب الوطنی اور کرنسی کی کمی کے باوجود ہم نے بھی دوسو لیرا اس کے حوالے کر دیئے۔ پندرہ بیس منٹ میں چھ سات ہزار لیرا لکھا کر وہ دوسرے ریسٹوران کی جانب چل دیا۔ ہمارے دوست کہنے لگے ”بھائی اگر ہم بھی یہ کام سیکھ لیتے تو غربت میں یوں پریشان اور خوار نہ ہوتے۔ گٹار لے کر ہوٹل سے نکلتے اور ایک ہی دن میں مہینے بھر کا خرچہ کما لیتے۔“

یہ تو مستحقاروں کی آمدنی کا نہایت مہذب اور معقول طریقہ ہے۔ مگر انڈر گراؤڈ ٹرینوں کے سٹیشنوں پر اور مختلف بازاروں کے برآمدوں میں بھی کوئی صاحب یا ایک جڑا گٹار بجا کر گاتا ہوا نظر آ جاتا ہے، ان کے سامنے ایک ہیٹ پڑا ہوتا ہے جس کی طرف سے وہ بالکل بے پردا اور بے نیاز نظر آتے ہیں مگر گزرتے ہوئے لوگ اس میں سکتے اور بعض تو نوٹ بھی ڈال جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں کسی زمانے میں تو ہنسی ہوا کرتے تھے مگر بعد میں جب گداگری عام ہوتی تو مانگنے والوں میں ہر قسم کے لوگ نظر آنے لگے۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے۔

پیرس میں ہمارا قیام خلافت ترقی نو دس دن رہا۔ اس دوران میں زیادہ تر بارش رہی۔ پھر بھی ہمیں پیرس دیکھنے کا موقع مل گیا۔ سچ پوچھتے تو یہ شہر دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ کافی طویل عرصے رہنے کے لیے ہے۔ اس کے بغیر آپ پیرس کی لطافتوں اور نزاکتوں سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ نہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قوم اپنی نفاست طبع اور گونا گوں خوبیوں کے باعث اگر دنیا بھر میں مشہور ہے تو کوئی غلط نہیں ہے۔ آزادی اور حریت پسندی ان کے خون میں سرایت کر چکی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جس دنوں الجزائر کے لوگوں نے آزادی کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور فرانس کی حکومت اس کو بغاوت کہہ کر کچلنے کی کوششوں سے مصروف تھی اُس زمانے میں بھی فرانس کی آبادی کا ایک معقول حصہ اس ظلم و نا انصافی کا سخت

خائف تھا۔ فرانس کے ادیب اور صحافی اس ظلم کے خلاف کہانیاں اور ادارتیں لکھ رہے تھے، شاعر نظیں تحریر کر رہے تھے، آرٹسٹ تصاویر بنا رہے تھے اور کھلم کھلا اپنی حکومت کو مطعون کر کے اس پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ الجزائر میں ظلم و ستم بند کر کے وہاں کے لوگوں کو خود مختاری دے دی جائے۔ جو بالآخر ہوا بھی۔ مگر فرانس کے لوگوں نے اس تحریک آزادی میں جو خود ان کی حکومت اور قوم کے خلاف تھی، دنیا کی دوسری اقوام سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا یہاں تک کہ الجزائر کو آزادی دلا کر ہی چھوڑی۔ آج بھی فرانس اپنی حریت پسندی اور آزادی طبع کے لیے مشہور ہے۔ فرد کی آزادی مثالی صورت میں وہاں موجود ہے۔ جمہوریت اپنی اصل روح سمیت اس ملک کے جسم و جاں میں سمائی ہوئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانس کو جرمن تسلط سے آزادی ملی تو ملک میں دوبارہ جمہوریت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ اُس زمانے میں سیاسی جماعتوں کی کثرت تعداد کے اعتبار سے فرانس کی حالت وہی تھی جو آج پاکستان کی ہے۔ انتخابات میں کوئی ایک جماعت واضح اکثریت حاصل نہ کر سکتی تھی تو حکومت ٹوٹ جاتی تھی اور از سر نو انتخابات منعقد ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے حکومتوں کی زندگی بہت مختصر ہوا کرتی تھی۔ بعض حکومتیں تو تین دن بھی قائم نہ رہ سکیں۔ لیکن جمہوری روایات ہر صورت میں رہنمائی گئیں۔ سیاسی، اقتصادی، سائنسی اعتبار سے فرانس آج بھی رقبے کے اختصار کے باوجود سرکردہ اقوام عالم کی فہرست میں شامل ہے اگرچہ بارہا وہاں سیاسی اور اقتصادی مسائل بھی پیدا ہوتے مگر قوم نے ان پر قابو پایا۔

اگر جنرل ڈیگال کو جدید فرانس کا نجات دہندہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ شخص اپنی ثابت قدمی، اصول پرستی اور خود اعتمادی کی بنا پر دنیا بھر میں شہرت رکھتا ہے۔ جرمنوں نے فرانس پر قبضہ کیا تو بھی آزادی کی تحریک چلاتے رہے۔ ملک

تذکرہ ہو رہا تھا ڈیگال کے زمانے اور ان کے بعد کے فرانس کا۔ ڈیگال نے فرانس کو وہ خود اعتمادی اور جرأت بخش دی تھی کہ یورپ میں بلکہ ساری دنیا میں امریکی فیصلوں کو لٹکانے والا اور امریکی حکومت سے اختلاف رکھنے والا یہ پہلا ملک تھا۔ امریکہ نے بہت ڈرایا دھمکایا، مختلف قسم کے ڈراوے دیئے، لالچ بھی دیئے مگر فرانس کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی۔ فرانس ہی یورپ کا پہلا ملک تھا جس نے امریکہ سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی اور معاملات طے کیے۔ فرانس کا کہنا تھا کہ امریکہ کو فرانس اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی خود مختاری اور راتے کا احترام کرنا چاہیے نہ کہ ان پر اپنی راتے اور مرضی ٹھونس جاتے۔ فرانس غالباً یورپ کا پہلا ملک تھا جس نے سب سے پہلے امریکہ کے ساتھ واقعی برابری کے تعلقات استوار کیے اور بہت سے نازک اور اہم مسائل میں امریکہ کی ایک نہ سنی۔ آج لوگ امریکہ کو جہوریت کا گوارہ کہتے ہیں اور اس میں شک بھی نہیں کہ امریکہ میں شخصی اور انفرادی آزادی بہت زیادہ ہے۔ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ مگر خدا جانے فرانس کی فضا اور آب و ہوا میں کیا بات ہے کہ انسان خود بخود تازگی، تنگننگی اور آزادی کا احساس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کوئی بہت اہم اور خاص قسم کا شخص بن گیا ہے۔ دل خود بخود سرخوشی اور سکون کے جذبات سے سرشار رہتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ حالانکہ یہ بھی یاد رکھیے کہ یہ وہ ملک ہے جہاں کے لوگ میری زبان نہیں سمجھتے اور جن کی زبان میں نہیں سمجھتا، مگر پیرس الفاظ کا غنج نہیں ہے۔ یہ ہر ایک کے ساتھ ایک ذہنی، جذباتی اور تصوراتی رابطہ پیدا کر لیتا ہے اور پھر ایک عجیب و غریب بات میں نے یہ بھی محسوس کی کہ پیرس کی ہر خوبی اور وہاں کے ہر تاریخی درشنے پر میرا بھی یوں فخر کرنے کو جی چاہا جیسے وہ میرا ہی ہو۔ حالانکہ میں نے دوسرے شہروں کے نوادرات اور میوزیم بھی دیکھے۔ شہروں کے حسن و رعنائی

کی آزادی کے بعد جب دیکھا کہ کوئی ان کی بات پر کان نہیں دھرتا تو پیرس کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے گاؤں کے مکان میں جا کر بیٹھ گئے۔ جہاں ٹیلی فون تک نہ تھا۔ بوری سے کہا کہ جب قوم کو میری ضرورت ہوگی تو خود ہی مجھے تلاش کر لے گی۔ اس طرح گوشہ نشینی اور گمنامی کا زندگی کا آغاز کیا۔ مگر کچھ سال بعد وہی ہوا جس کی ڈیگال نے پیش گوئی کی تھی۔ قوم کو آخر کار ڈیگال کی ضرورت محسوس ہوئی تو لوگ جنرل ڈیگال کو تلاش کرتے ہوئے ان کے گاؤں کی رہائش گاہ میں پہنچے۔ جنرل ڈیگال نے اس شرط پر واپس آنا قبول کیا کہ وہ کسی غلط اور غیر اصولی بات پر سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ فرانس کی سربراہی سنبھال کر ڈیگال نے بعض انتہائی پُر خطر فیصلے کیے، کوئی اور فرانسیسی لیڈر ایسے اقدامات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جنرل ڈیگال نے مصلحتوں اور دنیا کی نکتہ چینی کو بالاتے طاق رکھ دیا اور فرانس کو ایک نئی زندگی بخش دی۔ الجزائر کو آزادی دینے کا فیصلہ بھی جنرل ڈیگال ہی نے کیا تھا۔ جنرل ڈیگال کی کئی خصوصیات قائد اعظم کے مانند تھیں۔ وہی اصول پر ڈٹ جانا۔ مصلحت کے آگے سر نہ جھکانا۔ بصیرت اور حد سے زیادہ بڑھی ہوئی فیصلے کی قوت۔ دراصل یہ لوگ لیڈر تھے۔ قوم کی راہنمائی کرتے تھے۔ وہ قدم اٹھاتے تھے جن کی ان کے خیال میں قوم اور ملک کو ضرورت تھی۔ قوم کے مزاج اور موڈ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تھے۔ دیکھا جلتے تو قیادت کی یہی شان ہونی چاہیے۔ ہمارے مرحوم صدر ایوب خاں کو بھی ان کے مذاحوں نے ایشیا کا ڈیگال کہنا شروع کر دیا تھا اور خود صدر ایوب مرحوم کو بھی کسی حد تک یقین آ گیا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جنرل ایوب اور جنرل ڈیگال میں کوئی ایک بات بھی مشترک نہ تھی سوائے اس کے کہ دونوں حضرات فوجی تھے۔ بنیادی چیز تو یہ تھی کہ ڈیگال کے خیالات اور فیصلے اپنے ہوا کرتے تھے جبکہ صدر ایوب دوسروں کے مشورے پر عمل کیا کرتے تھے۔ خیر، یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔

سے لطف اندوز بھی ہوا۔ مگر ہر دم ہی احساس رہا کہ اس میں میرا کچھ بھی نہیں ہے یہ تو دوسروں کی میراث ہے۔ حد تو یہ ہے کہ لندن کے عجائب گھروں میں ہندوستانی نوادرات کو دیکھ کر بھی مجھے اپنائیت کا احساس نہ ہو سکا۔ بے نا عجیب بات؟ لیکن پیرس کے عجائبات اور قابل دید مقامات کے بارے میں سچی جانتے ہیں۔ لیکن ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ دنیا کے اکثر مشہور مقامات کے بارے میں جو سن رکھا تھا یا تصویریں دیکھ کر اُن کے بارے میں جو اندازے قائم کیے جب بنفس نفیس وہاں گئے اور اپنی آنکھوں سے دیکھا تو نہ وہ دلکشی اور خوبصورتی نظر آئی نہ وہ شکوہ۔ لیکن پیرس کی بات مختلف ہے۔ آریج ڈی ٹرائف۔ شانزے لیزے، ایفل ٹاور اور خود سارا شہر پیرس تصویروں اور تصورات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہے۔ مثال کے طور پر ایفل ٹاور فلموں اور تصویروں میں محض ایک اونچا سا مینار ہی تو نظر آتا ہے لیکن جب وہاں گئے اور ایفل ٹاور کو دیکھا تو مرعوب ہو کر رہ گئے۔ بلکہ یوں سمجھتے کہ سم گئے۔ ہم نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے آس پاس کا علاقہ اس قدر وسیع و عریض اور دلکش ہے کہ ایفل ٹاور سے قطع نظر اس کے ارد گرد کا ماحول بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایفل ٹاور اس قدر حبیب اور دیو قامت چیز ہے کہ انسان دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ سالہا سال قبل لوہے اور فولاد کی اس قدر جامع، پیچیدہ اور عظیم الشان دیوہیکل چیز بنا دینا واقعی انسانی ہنرمندی اور ذہن کا کمال ہے اور پھر حُسن و نفاست کے اعتبار سے بھی یہ خاصے کی چیز ہے۔ ایفل ٹاور کے اوپر سے پیرس کا نظارہ ظلمات سے کم نہیں ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی اقوام نے کسی زمانے میں ساری دنیا کو زیر و زبر اور محکوم بنا رکھا تھا۔ آخر ان میں کوئی تو خوبی اور عظمت تھی اور اب بھی جبکہ فرانس کی نوآبادیاں، جو سارے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی تھیں، باقی نہیں رہی ہیں اور فرانس سمٹ اور سکڑ کر اپنی جغرافیائی حدود میں محدود ہو کر رہ گیا ہے، یہ قوم

ساری دنیا سے خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔ کہاوت ہے کہ باقی ٹٹنے پر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ فرانس بھی اپنی نوآبادیوں سے محروم ہونے کے باوجود اپنے حُسن، اثر و سونخ اور اپنی عظمت سے محروم نہیں ہوا ہے۔

پیرس کے ریستورانوں اور ہوٹلوں کے ساتھ ساتھ کھانوں کے بارے میں بھی کچھ بتاتے چلیں۔ فرانس کے کھانے دنیا بھر میں مشہور ہیں مگر افسوس کہ ہم پاکستانیوں کے ذوق پر پورے نہیں اُترتے۔ یہ پھیکے، بدمزہ کھانے بھلا ہمیں کیا پسند آتے۔ جہاں تک سمندری خوراک کا تعلق ہے وہ ہمیں پسند ہی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ بیشتر کھانوں میں کسی نہ کسی طور ”جمن“ کا استعمال بھی ہوتا ہے جو سور کا فرانسیسی شلخص ہے۔ ہم نے بعض کھانے بہت دیر تک میز کا مطالعہ کرنے کے بعد چکھنے کی غلطی بھی کی مگر شومی قسمت سے ایک بھی ہمارے حلق سے نہ اُتر سکا۔ لیکن یورپین کھانوں کے شائقین کے لیے فرانس کے کھانے نعمت سے کم نہیں ہیں۔ اتنے انواع و اقسام کے ہوتے ہیں کہ نام یاد رکھنا بھی دشوار ہے۔ ان کو بڑی نفاست، نزاکت اور خوبصورتی سے سجایا جاتا ہے اور اس قدر لطیف اور حسین شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ جی نہیں چاہتا کہ کھائیں بلکہ دل چاہتا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیں۔ جس طرح مصل اور نوابان اودھ نئی نئی اقسام کے کھانے ایجاد کرنے میں مصروف رہا کرتے تھے، اودھ یورپ میں فرانس والے بھی اسی شکل میں لگے ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کے ہاں بھی کھانوں کی اقسام کی فہرست شیطان کی آنت کی مانند طویل ہے۔ یوں بھی فرانس والوں کی جدت طبع نے ہر میدان میں نئے نئے گل کھلاتے ہیں۔ کھانے، بلذات، شرابیں، خوشبوئیں ہر چیز میں ایجادیں کرتے رہتے ہیں اور پھر بھی انکی سیری نہیں ہوتی۔ خوشبو ہی کو دیکھتے تو بے شمار اقسام کی خوشبوئیں بنا رکھی ہیں۔ اور تو اور پیر کم سے کم بچپن ساتھ مختلف ذائقوں۔ شکلوں اور اقسام کا ہوتا ہے ہم نے ایک ریستوراں میں پیر کی فرمائش کی تو نازک اندام و ٹیریس ایک ٹرالی لے کر

ہوتے۔ ہم تو بہت شرمناک شرمی میں وہاں گئے تھے۔ سوچا تھا کہ نگاہیں جھکا کر رہیں گے مگر دیکھا کہ وہ تو ایک نہایت گستاخ اور بارونق علاقہ ہے اور انتہائی صاف ستھرا۔ درمیان میں باغ سب اور دونوں اطراف میں چوڑی سڑکیں ہیں۔ بہت وسیع فضا پاتھ ہیں جہاں رات اور دن میں ہر وقت میں سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ کیفے اور ریسٹوران بھی بہت ہیں جہاں بیٹھ کر سیاح اپنے عزیزوں، دوستوں اور گھر والوں کو تصویروں والے پوسٹ کارڈ لکھتے ہیں۔ ہر قسم کی دوکانیں اس علاقے میں موجود ہیں۔ البتہ نانٹ کلبوں کا یہ گڑھ ہے اور سیکس شاپس بھی زیادہ اسی علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ مگر ماحول انتہائی صاف ستھرا اور پاکیزہ ہے اور کسی قسم کی گندگی کا احساس مطلق نہیں ہوتا۔ ہر ملک اور قوم کے مرد اور عورتیں ہیں کہ غول در غول راکشت میں مصروف ہیں۔ ریسٹوران میں کھاپی رہے ہیں۔ دوکانوں سے شاپنگ کر رہے ہیں۔ غالباً اس علاقے کی عالمی شہرت کے پیش نظر وہ یادگار کے طور پر ”پگمال“ سے چیزیں خریدنا پسند کرتے ہیں۔ ہم حیران تھے کہ پھر وہ ”بازار حسن“ کہاں ہے؟ ہم نے لاہور کی ہیرامنڈی، دہلی کا چاڑی بازار، کراچی کی نینتیر روڈ بھی دیکھی ہے اور اسی قسم کا ماحول تصور ذہن میں لے کر گئے تھے مگر سوائے نانٹ کلبوں اور سیکس شاپس کی موجودگی کے اس بازار میں بظاہر کوئی عامیانہ پن یا بے ہودگی نظر نہیں آتی اور لوگ بھی انتہائی شائستہ اور مہذب۔ پوچھا آخر وہ گلیاں کہاں ہیں جو قلم ”ارمالا ڈوس“ میں دیکھی تھیں؟ ایک صاحب نے اشارے سے سامنے کی طرف اشارہ کیا جہاں گستاخ سڑک کے ساتھ ساتھ صاف ستھری گلیاں بھی تھیں۔ جب اس فٹ پاتھ پر سے گزرے اور گلیوں میں نظر ڈالی تو یہاں وہاں کچھ حسینائیں دیواروں سے ٹیک لگائے کھڑی نظر آگئیں اور ہمیں دیکھ کر بہت اپنائیت اور خلوص سے مسکرائیں بھی۔ یہ تو دن کا وقت تھا سنا ہے رات کو ان گلیوں میں اور

آگئیں جس میں عجیب عجیب شکلوں کی چیزیں بھی ہوتی تھیں۔ کسی پرسکٹ کا، کسی پرکیک کا۔ کسی پرکباب کا گمان گزرتا تھا۔ معلوم ہوا یہ سب پیر کی مختلف اقسام ہیں ہم تو جیسے فرمائش کر کے بھنس گئے۔ کیا کھاتیں، کیا نہ کھاتیں؟ ایک پیر ایسا دیکھا جس میں کیڑے ٹھلارہے تھے۔ ہمیں تو بہت گھن آتی مگر ہمارے دوست نے بتایا کہ یہ بے حد قیمتی اور لذیذ پیر سمجھا جاتا ہے۔ ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں جو آنکھوں دیکھی کتنی نہیں نگل سکتے بھلا آنکھوں دیکھے کیڑے کوڑے کیسے ہضم کر لیتے؟ آخر ہم نے بہت غور و خوض کے بعد وہی پیر پسند کیا جو لاہور میں بھی دستیاب ہے اور جو ہم بہت شوق سے کھاتے ہیں۔

پیرس میں نو دس دن کا قیام بے حد پر لطف اور رنگین رہا۔ ہاں۔ یہ تو بتانا ہی بھول گئے کہ ہم نے پیرس کی ہیرامنڈی بھی دیکھی۔ کچھ عرصے قبل ایک امریکی فلم میں پیرس کا بازار حسن دکھایا گیا تھا۔ وہاں گئے تو سب نے کہا کہ بھلا یہ کیا ٹھکانہ ہے کہ پیرس میں آئیں اور بازار حسن نہ دیکھیں۔ وطن واپس پہنچ کر لوگوں کو کیا جواب دیں گے؟ چنانچہ ٹیکسی میں سوار ہو کر ”پگمال“ کی راہ لی۔ ٹیکسی ڈرائیور اس قدر باتونی تھا کہ ہم روم کے ٹیکسی ڈرائیور کو بھول گئے۔ اللہ کے بندے نے قسم کھانے کو بھی سانس تک نہ لی اور لگاتار بولتا ہی رہا اور وہ بھی سو فیصد فرانسیسی زبان میں۔ ہماری میں تو خاک بھی نہیں آیا۔ تنگ آکر اداکار نہری صاحب نے اس کی تقریر بند کرنے کے لیے اس سے پنجابی بولنی شروع کر دی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ بھونچکا رہ گیا اور ایک دم خاموش ہو گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ہاتھوں کو حرکت دے دے کر دوبارہ اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا جو اسے بل کی ادائیگی کرنے تک جاری رہا۔ یقین کیجئے اگر ہم پیرس کی سڑکوں سے ناواقف نہ ہوتے تو اس شخص سے محفوظ رہنے کی خاطر راتے میں ہی اتر جاتے۔ ”پگمال“ پہنچے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور بہت حیران بھی

ناچنے والی لڑکیوں کے لباس کو آپ قابل اعتراض اور عریاں کہہ سکتے ہیں مگر مغرب میں تو عریانی ویسے بھی قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ اور کوئی قابل ذکر یا قابل اعتراض چیز نہیں رہ جاتی۔ بعد میں دُنیا بھر میں ہر شہر میں بڑے بڑے ناٹس کلب بن گئے مگر پیرس والوں کو اس میدان میں بھی راہنمائی کا شرف حاصل ہے۔ دس دن کے بعد ہم بذریعہ ٹرین پیرس سے ہالینڈ کے شہر ہیگ روانہ ہو گئے۔



زیادہ روشنی ہوتی ہے۔ قہقروں کی بھی اور ماہتابی چہروں کی بھی۔ بہر حال ہمیں تو پیرس کا بازارِ حُسن دیکھ کر خاصی مایوسی ہوتی۔ وہ ہماری دلی بات ہی نہیں ہے۔ آخر میں ناٹس کلبوں کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ ہم سے ایک صاحب نے کہا تھا کہ اگر پیرس سے ناٹس کلب دیکھے بغیر ہی چلے گئے تو لوگوں کو کیا مَنہ دکھاؤ گے؟ پیرس میں ہر قسم کے ناٹس کلب موجود ہیں۔ سستے کلبوں میں ظاہر ہے کہ عامیانہ اور سستی حرکتیں دیکھنے میں آتی ہیں مگر مشہور زمانہ ناٹس کلبوں کی بات ہی الگ ہے۔ مثال کے طور پر ”لیڈ“ اور ”مولین رُڈز“ وہاں کے دو نہایت مشہور اور بڑے ناٹس کلب ہیں۔ ان کے ٹکٹ بھی بہت مہنگے ہوتے ہیں مگر اس میں کلام نہیں کہ ان کے شو دیکھنے والے کی سٹی گم کر دیتے ہیں اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ ایک محدود سی عمارت کے سٹیج پر یہ سب تماشے کیوں کر دکھائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ہم نے دیکھا کہ ہر طرف تاریکی بچھاتی ہوتی ہے۔ لوگ اپنی میزوں پر خاموش منتظر ہیں۔ اچانک دُور ایک سُرخ روشنی کا نقطہ سا نظر آیا جو بڑھتے بڑھتے نزدیک آیا تو ہیلی کا پٹر نکلا۔ اب ایک زیر زمین عمارت میں جو بیٹا ہر عام عمارتوں کی مانند ہے ہیلی کا پٹر اُڑنے کا تصور ہی ناقابل یقین ہے۔ مگر یہ سچ بچ ہو رہا تھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے۔ ہیلی کا پٹر میں سے درجنوں بلکہ سینکڑوں لڑکیاں کو دکود کر باہر نکلیں اور انھوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ نہ جانے ہیلی کا پٹر کس وقت اور کہاں چلا گیا۔ پھر جو شو کا آغاز ہوا تو آخر تک ایک آئٹیم کے اندر سے دوسرا آئٹیم خود بخود یوں نمودار ہوتا کہ دیکھنے والا ہکا بکا رہ جاتا۔ سینکڑوں لڑکیاں ناچ رہی ہیں۔ کبھی بازی گر تماشہ دکھا رہے ہیں یہاں تک کہ ریگستان میں گھوڑے دوڑتے ہوتے بھی نظر آگئے۔ پھر نختان کا منظر سامنے آیا۔ دراصل اس شو کے بارے میں بتانا ممکن نہیں ہے کہ اس سے انصاف نہیں ہو سکے گا۔ وہ تو بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

صاحب سے پوچھا کہ یہ ٹرین کتنی دیر میں جینوا پہنچے گی۔ میں دراصل مسافت اور وقت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ انھوں نے جواب میں کہا ”ایک بج کر چالیس منٹ پر“ لیجئے۔ جھگڑا ہی ختم ہو گیا اور اس وقت تو قافلہ ہی ہو گئے جب ٹرین واقعی اسی وقت جینوا کے پلیٹ فارم میں پہنچ کر رُک گئی۔ ٹرینوں میں عموماً بہت زیادہ ہجوم نہیں ہوتا نہ ہی پلیٹ فارم پر مسافروں کا جم غفیر ہوتا ہے۔ دھکم دھکا اور بد نظمی کا تو رپ میں ویسے بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ وقت مقررہ پر ٹرین پہنچی۔ اترنے والے مسافر پہلے ہی مختصر سا سامان سنبھالنے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ ٹرین سے اترنے میں چند سیکنڈ ہی لگاتے ہیں۔ اسی طرح سوار ہونے والے مسافر چند سیکنڈ میں سوار ہو جاتے ہیں۔ نہ قیوں کا شور، نہ ہاکروں کی آوازیں، نہ ایک دوسرے کو دھکیل کر سوار ہونے کی کوشش، نہ کھڑکیوں کے راستے بچوں اور سامان کو ڈبے میں داخل کرنے کا مظاہرہ، لیجئے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں مسافر اتر بھی گئے اور سوار بھی ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر پلیٹ فارم پر ٹرین کے رُکنے کا وقت زیادہ سے زیادہ ایک دو منٹ ہی ہوتا ہے۔

مگر اس سے پہلے پیرس سے رخصت ہونے کا کچھ بیان ہو جائے ہمارے ہاٹل پیرس میں ریلوے سٹیشن ”گارڈونارد“ کے سامنے واقع تھے یعنی شمالی ریلوے سٹیشن۔ پیرس میں چار ریلوے سٹیشن اپنی سمت کے اعتبار سے منسوب ہیں اور ظاہر ہے کہ بے حد مصروف رہتے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی سبھی مسافر یہاں سے سفر کرتے ہیں انڈرڈن ملک اور غیر ملک ہر جگہ کے لیے ہیں سے ٹرین ٹرینیں چلتی ہیں اس لیے خاصی رونق اور گھاگھی رہتی ہے۔ یہ ریلوے سٹیشن بھی ایک خوبصورت اور کشادہ عمارت ہے جہاں کرنسی تبدیل کرانے سے لے کر راشی اشیاء اور لوازمات تک سبھی چیزوں کا چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ مینگ آفس بہت وسیع اور ارگنڈیشنڈ ہوتے

ڈراہلینڈ

یورپ میں ریل کا سفر ایک انتہائی دل خوش کن تجربہ ہے۔ خوبصورت، صاف ستھرے آرام دہ کمپارٹمنٹ، منڈب اور خوش گفتار اور خوش لباس ہم سفر۔ جن راستوں سے ریل گزرتی ہے ان کا حُسن بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے شہر، قصبات، دیہات اور نہایت مختصر گاؤں تیزی سے تیچھے کی جانب دوڑتے ہوئے جھنڈنگاہ تک سرسبز و شاداب پہاڑیاں، میدان اور چراگا ہیں۔ غرضیکہ ایک عجیب و دلکش منظر ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ یہ سفر ختم نہ ہو۔ نہ کمپارٹمنٹ میں اور نہ ہی پلیٹ فارم پر شور و غل اور ہڑبومگ نام کی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہر ریل گاڑی میں ایک ڈائنگ کار بھی ہوتی ہے جہاں سے آپ اپنی ضرورت کی کھانے پینے کی اشیاء (عموماً سٹیکس، جوس، چائے، کافی وغیرہ) خرید سکتے ہیں۔ اور پھر اگر آپ ایک ملک سے دوسرے ملک کے لیے سفر کر رہے ہوں تو اور بھی پُرکٹت تجربہ ہوتا ہے۔ ٹرینوں کا قصہ یہ ہے کہ یہ مقررہ وقت پر اپنے مُستقر سے چلتی ہیں اور ہر سٹیشن پر عین اسی وقت پہنچتی ہیں جو ان کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ گھنٹوں کی تو بات ہی کیا ہے منٹوں اور سیکنڈوں کے حساب سے بھی ٹرین لیٹ نہیں ہوتی۔ مجھے پہلی بار بہت عجیب سا لگا جب میں نے سوئزرلینڈ میں گوزان سے جینوا جاتے ہوئے ایک

مقررہ وقت کے اندر ٹرین میں لا دیتا ہے۔ انھوں نے وعدہ تو نہیں کیا البتہ یہ کہا کہ کوشش کریں گے۔ چنانچہ طے پایا کہ ٹرین کی آمد سے پہلے ہی وہ ٹرالی میں سامان لے کر تیار رہیں گے اور جیسے ہی ٹرین رُکی ہم سب مل کر یہ سامان ٹرین میں لا دیں گے۔ جب ٹرین آتی تو ہم سب نے سامان اٹھا کر اندھا دھند ٹرین میں رکھنا شروع کر دیا حالانکہ پہلے ہمیں اُترنے والے مسافروں کو موقع دینا چاہیے تھا۔ وہ بے چارے اس آفتِ ناگہانی سے گھبرا گئے۔ بہر حال ہم سب نے مشکل تمام سامان ٹرین میں لا دیا۔ اگر پورٹرز پر بھروسہ کرتے تو قریباً آدھا سامان وہیں رہ جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ اُترنے والے مسافروں نے اور ٹرین میں بیٹھے ہوتے مسافروں نے، ہمیں بہت گھور گھور کر دیکھا۔ مُنہ سے کچھ کہنے کا وہاں رواج بالکل نہیں ہے۔ مگر یہاں گھورنے کی پروا کسے ہوتی ہے۔ اور پھر یہ تو ہنگامی حالات تھے۔ ٹرین مقررہ وقت پر چل پڑی اور ہم میں سے چند حضرات مشکل بھاگتے ہوئے چلتی ٹرین میں سوار ہوتے۔ یہ بھی وہاں والوں کے لیے ایک عجیب و غریب نظارہ تھا کیونکہ چلتی ریل گاڑی میں سوار ہونے یا اس میں سے اُترنے کا وہاں کوئی رواج نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر کسی پولیس والے کی نظر پڑ جاتی تو وہ ہمیں اس جرم میں دھر ہی لیتا۔ مگر خیریت گزری کہ آس پاس کوئی قانون نافذ کرنے والا افسر موجود نہیں تھا۔ ٹرین میں سوار ہونے کے کچھ عرصے بعد ہوش و حواس بجا ہوتے اور ہم لوگوں نے سامان کو ٹھکانے پر رکھنے کے مسئلے سے فرصت، باقی تو ریل گاڑی کے تمام ڈبوں کا ایک دوسرے سے دوسرے سرے تک جائزہ لیا گیا۔ یہ تمام ڈیٹے آپس میں منسلک ہوتے ہیں۔ آخری کنارے پر ڈائننگ کار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے کنارے پر انجن۔ آرام دہ سیٹوں پر بیٹھ کر ہم نے کھڑکی سے باہر فرانس کے کنٹری سائیڈ کا نظارہ شروع کیا جو حقیقت میں ایک انتہائی خوبصورت بقرہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنے کھیتوں اور

ہیں اور عام طور پر وہاں لوگوں کا ریش ہوتا ہے مگر کیا مجال جو کوئی اونچی آواز سے بولے یا منور کرے۔ آپ داخل ہو کر ایک کھڑکی پر جائیں تو وہاں سے آپ کو منبر مل جاتا ہے۔ پھر آپ آرام دہ سیٹ پر بیٹھ کر سامنے لگے ہوتے برقی بورڈ کو دیکھتے رہیں جہاں یکے بعد دیگرے نمبر نمودار ہوتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی کھڑکی کا نمبر بھی ہوتا ہے۔ نمبر آنے پر آپ اپنی کھڑکی پر جا کر ٹکٹ خریدتے یا سیٹ ٹکٹ کر لیتے۔ ہمارے ہاں تو جب ہوائی سفر بہت عام نہیں ہوا تھا اور کم ہی لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے تھے اس وقت بھی اتر لا تنز بکنگ آفسوں میں قیامت کا سماں نظر آتا تھا۔ یورپ میں پلیٹ فارموں پر اشیاء فروخت کرنے والے اور ریڑھی والے بھی نہیں ہوتے۔ نہ ہی دوکانیں ہوتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ سگریٹ جیسس، چاکلیٹ یا مشروبات کی فروخت کے لیے مشینیں لگی ہوتی ہیں آپ سکتے ڈالے اور اپنی مطلوبہ چیز نکال لیجئے۔ فرش پر بوڑھا پھینکنے کا رواج بھی نہیں ہے اس لیے سٹیشن انتہائی صاف ستھرے نظر آتے ہیں ہم لوگوں کو ٹرین کے ذریعے ہالینڈ جانا تھا۔ سترہ اٹھارہ افراد تھے اور پھر ذاتی سامان کے علاوہ فلمی ضروریات کے لیے بھی سامان کا ڈھیر ساتھ تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ٹرین — تو ایک ڈیڑھ منٹ کے لیے ہی پلیٹ فارم پر ٹھہرتی تھی۔ اب اتنا ڈھیر سامان اتنی عجلت میں کیونکر ٹرین میں لا دیا جاتے اور پھر سیگ کے پلیٹ فارم پر اتنے جھٹ پٹ کیسے اُتارا جاتے؟ فلیوں کا وہاں رواج نہیں ہے ہاں زیادہ سامان ہو تو ٹرالی والا پورٹر دستیاب ہو جاتا ہے۔ ہم نے تین چار پورٹرز کی خدمات خاص طور پر حاصل کیں۔ انھیں جب سامان دکھایا تو وہ حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔ انھوں نے مسافروں کے ساتھ اس قدر زیادہ سامان کا ہے کہ دیکھا ہوگا۔ بہر حال انھیں سمجھا گیا کہ یہ فلمی یونٹ کی ضرورت کا سامان ہے اور

ملکوں کی سرزمین سے گزرنے کے لیے بھی دیر کا رہنا ہے۔ بہر حال یورپ میں ریل کا یہ سفر انتہائی دلچسپ اور خیال انگیز تھا۔

اگلی منزل ہیگ تھا جسے مقامی لوگ ڈین ہیگ کہتے ہیں۔ سب سامان سمجھال کر پہلے ہی سے تیار ہو گئے اور جوں ہی پیٹ فارم پر گاڑی رکی سب نے فوجی قسم کی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک منٹ کے اندر ہی تمام سامان باہر نکال دیا۔ جب ٹرین نے سیٹی دی اور حرکت میں آئی تو صرف قدیر ملک صاحب اپنا سفری بیگ تھامے ہوئے ٹرین سے چھلانگ لگاتے ہوئے نظر آتے ہوئے شکر ہے کہ ان پر کسی اور کی نظر نہیں پڑی۔ پورٹرز کے ذریعے سامان سمیٹ کر ہم لوگ پیٹ فارم سے باہر نکلے تو دیکھا کہ انتہائی وسیع و عریض اور شگاف عمارت ہے۔ اب سوال اقامت تھا۔ یہ شہر بھی ہم سب کے لیے اجنبی تھا مگر شکر ہے کہ ہالینڈ میں انگریزی بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد یورپ کے دوسرے ملکوں سے کہیں زیادہ ہے۔

خواندگی کا اوسط تو ظاہر ہے کہ سو فیصد ہے مگر انگریزی جلنے اور پڑھنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے جو یورپ کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ ہم نے دیوے حکام سے ہوٹل وغیرہ کے بارے میں معلومات کرنی چاہیں تو انھوں نے سامنے ہی واقع ایک دفتری طرف اشارہ کیا۔ یہ ۷۰۷۔۷ (دی۔دی۔دی) کا ادارہ ہے۔ اندر گئے تو ایک سمارٹ اور خوش مزاج لڑکی کاؤنٹر پر دو تین ٹیبل فون لیے بیٹھی تھی۔ سامنے سیاحوں کا ہجوم تھا اور وہ ہر کسی سے اس کی زبان میں بات کر رہے تھے۔ کسی سے ڈچ زبان میں، کسی سے جرمن میں، کسی سے فرانسیسی میں تو کسی سے انگریزی میں۔ مختصر یہ کہ ہنست زبان لڑکی تھی اور خوش مزاج اور متعل مزاج اتنی کہ سیاحوں کی یورش اور سوالوں اور مسائل کی بوچھاڑ کے باوجود اس کے چہرے پر پریشانی یا جھنجھلاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ کسی کے لیے ہوٹل کا بندوبست کرتی

چراگاہوں کے علاوہ ساری زمین کو شیب و فراز کی صورت دینے کے بعد ہر طرف سبزہ اگانے کا اہتمام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کا کوئی خشک، بخر اور بد نما ٹکڑا دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔ کسانوں کے گھر مختصر لیکن انڈے کی طرح سفید، چمکتے ہوئے اور ارد گرد کا ماحول بھی صاف ستھرا اور دلکش۔ گھروں کے سامنے کاریں، ٹریکٹر اور جیپ گاڑیاں بھی کھڑی نظر آتیں۔ یورپ اور امریکہ کے دیہات شہروں سے زیادہ پرسکون و خوبصورت اور پرکشش ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ دیتا ہے وہ فلاحی دیہات میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ صاحب ثروت لوگ شہر کے ساتھ دیہات میں بھی اپنی رہائش کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان دیہات میں جدید زندگی کی تمام سہولتیں مہیا ہوتی ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر سکون اور خاموشی جس کا شہروں میں فقدان ہے۔

ڈین ہیگ

فرانس کی سرحدیں ختم ہوتیں اور بلجیم کا علاقہ شروع ہو گیا۔ بظاہر دیکھنے میں ہمیں دونوں ملکوں کے دیہات میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آیا۔ بلجیم کا دیرا ہمارے پاس نہیں تھا کیونکہ پاکستان سے روانہ ہوتے وقت یہ خیال بھی نہیں تھا کہ ہمیں بلجیم سے بھی گزرنا ہو گا۔ طریقہ یہ ہے کہ جوں ہی ایک ملک کی سرحد ختم ہو کر دوسرے ملک کی حد شروع ہوتی ہے۔ امیگریشن سے تعلق رکھنے والے ایک باوردی افسر آتے ہیں آکر پاسپورٹ اور دیرا چیک کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور کڑکڑنا صاحب آکر دریافت کرتے ہیں کہ مقامی کرنسی کی ضرورت تو نہیں ہے اور طلب کرنے پر مقامی کرنسی تبدیل کر دیتے ہیں۔ ہمیں انھوں نے اس لیے رعایت دے دی کہ ہم تو محض علاقے سے گزر رہے تھے۔ قیام کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ مگر یہ گزرے وقتوں کی بات ہے۔ رفتہ رفتہ امیگریشن کے قوانین میں بھی سختی پیدا ہو گئی اور اب تو مختلف

کسی کو متعلقہ مقام کا پتہ دیتی۔ کسی کے حوالے ڈین ہیگ یا ہالینڈ کا نقشہ کر دیتی۔ لڑکی کیا تھی انسانی مشین تھی۔ ہم نے بھی اپنا مسئلہ بیان کیا اور اس نے بتایا کہ ہٹلوں میں جگہ دستیاب نہیں ہے۔ پھر بھی کوشش کرتی ہوں کیونکہ مسافر تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش اور مشقت کے بعد اس نے دو مختلف ہٹلوں میں ہم لوگوں کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ ہٹل والوں سے بات چیت بھی طے کر دی اور ہمیں ایک پرچی پر ہٹلوں کے نام اور ٹیلی فون نمبر لکھ کر دے دیے۔ اس طرح ہم اس کی کارکردگی اور فرض شناسی پر عیش عیش کرتے ہوئے اُس دفتر سے نکلے۔ صاحب۔ ہم نے اور بھی بہت سے ملک اور شہر دیکھے مگر یہ طریقہ اور کہیں نظر نہیں آیا۔ دی۔ دی۔ دی ایک سرکاری ادارہ ہے جس کے دفاتر ہالینڈ کے ہر شہر قصبے اور دیہات میں موجود ہیں اور اس کا مقصد سیاحوں کو معلومات، رہنمائی فراہم کرنا ہے۔ اس خدمت کے عوض یہ سیاحوں سے کچھ وصول نہیں کرتے۔ خلاصہ یہ کہ اگر آپ کسی طرح ہالینڈ کی سرحد میں پہنچ کر دی۔ دی کے دفتر میں پہنچ گئے تو سمجھتے سارے دلدرد دور ہو گئے۔ اب آپ کا ہر مسئلہ دی۔ دی کا دوسرا ہے۔ حضرت خضر کے بارے میں جو داستانیں مشہور ہیں وہ دی۔ دی۔ دی پر حرف بحرف صادق آتی ہیں۔

ہیگ کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہٹل پہنچے۔ یہ قدیمی شہر ہے لیکن انتہائی خوبصورت اور صاف ستھرا۔ پورے ملک ہالینڈ کی مانند یہاں بھی شہر میں جگہ جگہ نہیں موجود ہیں۔ جن میں سے بعض میں کشتی رانی بھی ہوتی ہے۔ سڑکیں کشادہ اور صاف شفاف۔ نظم و نسق مثالی۔ لیکن سڑکوں پر ٹریفک اور لوگوں کا زیادہ ہجوم نظر نہیں آیا۔ دراصل وہاں ٹریفک اور ہجوم کے اوقات دو ہیں۔ ایک صبح نو بجے جب لوگ دفاتر اور کاروبار پر جاتے ہیں اور دوسرا شام کو پانچ بجے، جب گھروں کو واپس لوٹتے ہیں۔

شور، ہنگامہ اور ہجوم مطلق نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ ہیگ بین الاقوامی عدالت انصاف کا صدر مقام اور متعدد بین الاقوامی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کے باوجود (اُن دنوں) محض چھ لاکھ آبادی کا شہر تھا۔ لوگوں کا رجحان بھی شور و شر اور ہنگامہ بندی کی طرف نہیں ہے اس لیے بے حد پرسکون اور پرامن شہر ہے۔ سرشام ہی دوکانیں بند ہو جاتی ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد سڑکوں پر بہت کم لوگ دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان لوگوں کی امن دہشتی اور سکون پسندی کا یہ عالم ہے کہ بعض جگہ رہائشی آبادیوں کے عین درمیان ٹاٹ کلب واقع ہیں لیکن سوائے سائین بورڈ کے اس کے اور کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ نہ شور، نہ ہنگامہ نہ موسیقی، نہ لوگوں کا ہجوم۔ عام طور پر ٹاٹ کلب کے باہر تصاویر بھی نہیں ہوتیں۔ بہت ہوا تو چنڈا نسرول کی مقبول اور شریفانہ قسم کی تصویریں ایک طرف لگا دیں اور بس۔ نہ آس پاس والوں کو یہ احساس کہ بازو میں ٹاٹ کلب ہے اور نہ ہی ٹاٹ کلب والوں کو یہ شکایت کہ برابر میں گھریلو ماحول ہے۔ دونوں اپنے اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ یوں بھی ہالینڈ کے لوگوں کو ہم نے انتہائی خلیق، حلیم اور دوستانہ پایا۔ ان میں کسی قسم کی خجوبہ نہیں ہے۔ خواتین کی اکثریت پر مشرقی عورتوں کا لگان گزندہ ہے۔ پینا دے اور بالوں کی تراش کی حد تک تو وہ ظاہر ہے کہ یورپین ہیں مگر مزاج میں شرمیلے اور جھجکے۔ عام طور پر سیلر گزراور مختلف مقامات پر کام کرنے والی لڑکیاں نگاہ چڑا کر بات کرتی ہیں اور مردوں سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے چہروں پر حجاب کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یورپ کے دوسرے ملکوں کی خواتین کی طرح ان میں بے بالکی اور بے حجابی نہیں ہے۔ اور پھر یہ کہ آپ کی ہر بات کا بڑے اخلاق سے جواب تو دیں گی مگر مردوں سے غیر ضروری گفتگو اور میل جول سے احتراز کرتی ہیں۔ گھریلو پن اور گرمی میں یہ سارے یورپ میں مشہور ہیں اور

کہتے ہیں کہ بہترین بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔ ہم وہاں پہنچے تو کنوارے تھے ہمارے کوئی نہ کوئی ساتھی ہمیں ہر روز یہ مشورہ ضرور دیا کرتے تھے کہ بھائی۔ اچھا موقع ہے۔ یہاں سے ایک عدد بیوی تلاش کر کے لے چلو۔ یا پھر یہیں رہ جاؤ۔ دیکھو ترکس قدر حسین ماحول اور کتنے خوبصورت اور صحت مند لوگ ہیں (ہالینڈ دودھ دہی اور اس کی مصنوعات کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ایک ایسے ہی سٹور کی ایک نوجوان مالکہ کو ہمارے دوست ”دودھ والی“ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے اور وہ بھی ہنسی رہتی تھی، ہالینڈ کے مویشی بھی انتہائی صحت مند، توانا اور نایاب ہوتے ہیں اور وہاں کے ڈیری فارموں میں مویشیوں کے لیے جواہر تمام دیکھا اور سنا تو بے اختیار رشک کرنے لگا کہ کاش ہم بھی مویشی ہوتے۔ اور مویشیوں پر ہی کیا منحصر ہے۔ یورپ اور امریکہ میں تو پالتو جانوروں کے اتنے مزے ہیں کہ ہمارے ہاں اچھے خالص کھاتے پیتے انسانوں کو ایسے عیش نہیں ملتے۔ بلیوں اور گتوں کے لیے قسم قسم کے سر بند ڈبوں میں مختلف قسم کی غذا تیں ملتی ہیں اور وہ جو کچھ کھاتے ہیں ہمارے ہاں انسانوں کو بھی میسر نہیں ہے۔ ٹیلی ویژن پر ہر روز بے شمار کتوں اور بلیوں کے کھانوں کے نہایت اشتہار انگیز اشتہار پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک دن یا رخان خاص طور پر ہم سے ملاقات کے لیے آئے اور بہت حیران ہو کر پوچھنے لگے۔ ”یار۔ یہ بتاؤ کیا یہاں کے گتے بلیاں بھی تعلیم یافتہ ہوتے ہیں؟“

ہم نے کہا۔

”اور کیا۔ ان کے لیے بھی تعلیم لازمی ہے۔“

بولے۔

”ٹھیک ہے۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ وہ ان استیتھاروں کو پڑھے بغیر اپنی پسند کے کھانے کیوں کر انتخاب کرتے ہوں گے۔“

ہیگ کو آبادی کی قلت اور وہاں کے لوگوں کے گھریلو اور سادہ طرز زندگی کے باعث یورپ کا سب سے بڑا گاؤں ”کما جانا“ ہے کیونکہ یہاں شہروں جیسے ہنگامے، رونق اور شور شرابا نہیں ہوتا اور لوگ سرشام ہی اپنے اپنے گھروں میں پناہ لیتے ہیں۔

ہالینڈ جزیروں پر مشتمل ایک بے حد خوب صورت ملک ہے۔ مختصر مگر انتہائی مہذب اور ترقی یافتہ، یہاں پانی کی افراط ہے۔ ہر جگہ جھیلیں اور نہریں موجود ہیں۔ شہروں کے درمیان میں بھی نہریں بہتی ہیں جو شہروں کے حسن میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ پھر جیسا کہ پہلے عرض کیا لوگ بے حد خلیق اور ہنسار ہیں۔ ایک خاص بات یہ دیکھی کہ یہ لوگ پھولوں سے عشق کرتے ہیں۔ ہر گھر میں پھولوں کی کیاریاں نظر آجاتی ہیں۔ جن فلیٹوں میں باغ کی گنجائش نہیں ہے وہاں مکینوں نے مختصر سے ٹیریس یا کھڑکی میں پھولوں کے گئے سجا دیتے ہیں۔ ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں اور پھولوں کے درمیان پھول جیسے چہرے۔ مگر عجیب بات دیکھی کہ ٹرکوں اور بازاروں میں جا بجا پھول فروشوں کی مختلف سائز کی دوکانیں بھی ہیں۔ قیمت دریافت کی تو ہوش اڑ گئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ جب ہر طرف پھولوں کی افراط ہے تو پھر لوگ اتنے مہنگے داموں پھول کیوں خریدتے ہیں؟ بعد میں اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ پھول وہاں ہر گھر اور باغ میں موجود ہیں مگر وہ صرف خوشنمائی کے لیے ہیں۔ انہیں دیکھا تو جاسکتا ہے توڑا نہیں جاسکتا۔ توڑنے والے پھولوں کے باغات علیحدہ ہوتے ہیں اور میل ہا میل تک پھیلے ہوتے ہیں۔ بازار میں فروخت ہونے والے پھول صرف ان ہی باغات سے آتے ہیں اور کیونکہ ہالینڈ کے لوگ تحفے میں پھول پیش کرنا پسند کرتے ہیں اس لیے پھولوں کے گلدستے اور ڈالیاں بہت بڑی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ وہاں پھولوں کی دوکانیں اسی کثرت

سے ہیں جس طرح لاہور میں تگے کباب اور چائیں کی دوکانیں۔ اور یہ بہت منفعت بخش کاروبار ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ٹرٹ کی کہ (سٹسٹ میں) دیاں کے عام لوگ نہ صرف پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے بلکہ اس کے لیے دوستانہ جذبات بھی رکھتے تھے۔ ہمارے ہوٹل کے چوکیدار صاحب ایک ریٹائر فوجی تھے۔ جب باتیں کیں تو پتہ چلا کہ وہ پاکستان کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ حالانکہ یورپ اور امریکہ کے دوسرے ملکوں میں معلومات عامہ کا یہ معیار نہیں ہے۔ کافی دیر تک وہ پاکستان اور سٹسٹ کے حوالے سے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور ہم ان کی معلومات آفرینی پر حیران رہ گئے۔ آخر ہم نے پوچھا۔

”مسٹر کارک۔ آپ کی معلومات ہمارے ملک کے بارے میں بہت زیادہ ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

انھوں نے ہنس کر اپنے مصنوعی دانتوں کی تلاش کی اور بولے۔
 ”میرے دوست۔ وجہ یہ ہے کہ ہالینڈ میں تعلیم کا اوسط بہت زیادہ ہے اور یہاں کے لوگ مطالعے کے بہت شوقین ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ہر جگہ لوگ خالی اوقات میں کتابیں اور اخبار پڑھتے رہتے ہیں۔ بس یہی ان کی معلومات کا ذریعہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے ملک نے ایک بہت خوبصورت اور عالی دماغ خاتون کو ہالینڈ میں اپنا سفیر مقرر کر کے بھیجا جبکہ کسی یورپی ملک نے بھی اس سے پہلے یہاں کوئی خاتون سفیر نہیں بھیجا۔ ہم لوگوں کو یہ بات بھی پسند آتی اور پھر آپ کی سیفرنے ہالینڈ میں پاکستان کو متعارف کرانے کے لیے بہت کام کیا ہے۔ وہ یہاں بہت مقبول تھیں۔“

اُن کا اشارہ یکم رعنا یاقوت علی خاں کی طرف تھا۔

ہینگ کے گرد و نواح میں بے شمار تفریحی مقامات اور باغات ہیں۔ مگر سب سے انوکھی اور قابل دید چیز ”ٹیولپ کے کھیت“ ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے کہ ٹیولپ ایک انتہائی خوبصورت، بجلی کے بلب کی شکل کا پھول ہوتا ہے اور مختلف رنگوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ٹیولپ کی پیداوار کے لیے ہالینڈ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بہت وسیع پیمانے پر ٹیولپ کی کاشت ہوتی ہے۔

جہاں تک نگاہ جاتی ہے ٹیولپ کے کھیت ہی کھیت نظر آتے ہیں اور ہالینڈ والے اپنی خوش ذوقی کے پیش نظر مختلف رنگوں کے پھول ایک ترتیب اور مختلف قطاروں میں لگاتے ہیں یہ ایک انتہائی دلکش اور دل فریب نظارہ ہوتا ہے۔ ان کھیتوں کو کاٹنے کے لیے جدید ترین مشینوں سے مدد لی جاتی ہے۔ اس کے بعد انھیں نہایت جدید سائیکلک طریقے سے پیک کر کے بڑی احتیاط کے ساتھ دنیا بھر میں ایکسپورٹ کر دیا جاتا ہے۔ فقط ٹیولپ کے پھولوں کی برآمد کے ذریعے ہالینڈ ہر سال کروڑوں ڈالر کماتا ہے۔ دودھ کی مصنوعات، جدید ترین کمیکلز، پانی کے جہاز، ہوائی جہاز، موٹر گاڑیاں اور دیگر مشینیں اور آلات، خدا جانے کیا کیا یہ چھوٹا سا ملک بناتا ہے۔ ان لوگوں کی جفاکشی اور بلند ہمتی کے باعث ایک زمانے میں اس چھوٹے سے ملک نے بھی دنیا بھر میں اپنی نوابادیاں قائم کر دی تھیں اور فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیتے تھے۔ لیکن آج کے ہالینڈ کو دیکھتے تو یہ ایک امن پسند اور جمہوری ملک ہے۔ یہ مختصر ملک اپنی نوابادیلوں سے محروم ہونے کے باوجود انتہائی خوشحال اور ترقی یافتہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کو دیکھیں اس کے وسائل کو سامنے رکھیں اور پھر اس کی پیش قدمیوں کو دیکھیں تو نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ خود سے مقابلہ کرنے کے بعد شرمندگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ سب سے یہ مختصر ہے، جس کا بیشتر حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ ملاحی اور کشتی رانی کی صنعتوں

ہمیں ذاتی طور پر ”سی فوڈ“ پسند نہیں ہے۔ یورپین کھانا بھی زیادہ مرغوب نہیں ہے۔ چنانچہ جس شہر میں جاتے ہیں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ کوئی ایسی جگہ تلاش کی جاتے جہاں پاکستانی کھانا دستیاب ہو یا پھر اس سے ملتا جلتا کھانا مل جلتے۔ یورپ کے اکثر شہروں میں اس زمانے میں انڈین ریستوران موجود تھے۔ بعد میں بعض شہروں میں پاکستانی ریستوران بھی قائم ہو گئے۔ ہیگ کے ایک بہت شہرت یافتہ انڈین ریستوران میں ہم بھی گئے۔ اس قسم کے ریستوران بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ مگر خیر۔ دل پر پتھر رکھ لیا۔ ریستوران کا نام تھا ”بالی“۔ اندر سے اس کی آرائش اور کھانا سبھی ملعوبہ تھا۔ مثلاً یورپین ویٹریس لڑکیاں ساڑھیوں میں بلبوس تھیں مگر کسی ایک نے بھی ڈھنگ سے ساڑھی نہیں باندھی تھی اور ہندوستانی لباس اور بالوں کے جوڑوں میں بالکل کارٹون نظر آتی تھیں۔ ہوٹل کی سجاوٹ بھی آدھی تیز، آدھی بلیئر قسم کی تھی۔ کہیں مغربی فرنیچر اور کسی جگہ ہندوستانی منڈھے اور تھتے وغیرہ۔ یورپ والوں کے لیے ممکن ہے اس میں کوئی کشش یا جڈت ہو، ہم لوگوں کو تو یہ سب کچھ انتہائی مہکھنیز لگا۔ کھانے کا مینو دیکھا تو عجیب و غریب قسم کے نام۔ بہت سی چیزوں کے آگے منجبتی ”کا لفظ بڑھا کر اسے کلاسیکل رنگ دینے کی کوشش کی تھی۔ کھانا منگایا تو شکل و صورت ہی بالکل عجیب سی لگی۔ صاف لگتا تھا کہ پکانے والا دیسی نہیں ہے۔ کھا کر دیکھا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ لیکن بہت مہنگا کھانا تھا اس لیے قدر ویش بجان درویش کے مطابق زہر مار کیا۔ سارے ریستوران میں جو واحد خاص دہیسی اور مشرقی چیز تھی وہ ایک ستار نواز تھا جو ایک کونے میں چوکی پر بیٹھا سچ مچ کا اصلی ستارہ بجا رہا تھا۔ ہمیں تو یہ تجربہ بہت واہیات لگا مگر معلوم ہوا کہ پورے شہر میں اس انڈین ریستوران کی دھاک بیٹھی ہوتی ہے اور غیر ملکی جوق در جوق آتے ہیں۔

میں اس نے بہت کارہائے نمایاں کیے ہیں۔ یورپ کی اقوام کو دیکھنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی سر بلندی کا سبب کیا ہے۔ ہمیں بھی قدرت نے وسائل سے مالا مال کیا ہے اور کون سی نعمت ہے جو ہمیں نہیں بخشتی۔ لوگوں کو دیکھتے تو حد درجہ خفاکش اور آن تھک، نہ صرف جسمانی طور مضبوط ہیں بلکہ ذہنی صلاحیتوں کے معاملے میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ہم ترقی یافتہ اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ دن بدن ہمارے اور ان کے درمیان جوفرق ہے وہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ وہ مسلسل آگے کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں جبکہ ہم ترقی معکوس کر رہے ہیں۔ بلکہ جو خورٹری بہت خوبیاں ہمارے اندر باقی رہ گئی تھیں رفتہ رفتہ ان سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ خدا جانے داپسی کا یہ سفر کب، کیسے اور کہاں جا کر ختم ہو گا؟ خاص طور پر یورپ کے ملکوں میں سفر کرنے سے تو یہ احساس بہت شدت سے تنانے لگتا ہے۔ ہمارے ارباب اقتدار و اختیار، بڑے افسر، مختلف شعبوں کے ماہرین، مختلف محکموں کے نمائندے، دانش ور، صحافی، عام لوگ اب تو سبھی عموماً، ان ملکوں میں جاتے رہتے ہیں اور ان کی خوبیاں اور ترقیاں بھی دیکھتے ہیں۔ تو پھر احساس کیوں نہیں کرتے؟ اور اگر محسوس کرتے ہیں تو اس کا کوئی نتیجہ خیز اثر کیوں نہیں دیکھتے میں آتا؟ یہی سوچ سوچ کر ہم اپنا دل جلاتے رہے۔

ہیگ کہنے کو چھوٹا سا شہر ہے۔ لیکن ہمارے بڑے بڑے شہروں سے بھی زیادہ خوشنما اور آراستہ۔ دوکانیں اور بازار دیکھتے تو رشک آتا ہے۔ شاپنگ سینٹروں میں جا بجا آرائش کا اہتمام کیا گیا ہے اور پھولوں کے گملوں سے بازاروں کو سجایا گیا ہے۔ شیشے اور پلاسٹک سے ڈھکے ہوتے بازار بھی ہیں اور ان بازاروں اور گلی کوچوں میں گھومتا پھرنا بذات خود ایک مسرت انگیز تجربہ ہے۔ ساحل پر خوب رونق ہوتی ہے۔ ”سی فوڈ“ کے ریستورانٹ اور مختلف قسم کی تفریحات اور تھیل۔

روز ٹیڑپ کے کھیتوں میں شوٹنگ کا پروگرام تھا۔ یہ ٹیڑپ کے چل چلاؤ اور کٹائی کا موسم تھا۔ دیکھا کہ ایک صاحب ٹریکٹر ٹانگاڑی پر سوار ہیں۔ انھوں نے کھیتوں کے سامنے شوٹنگ کرنے پر تو کوئی اعتراض نہیں کیا مگر کہا کہ ہم پھولوں کی کٹائی کر رہے ہیں۔ آپ اس سے پہلے شوٹنگ کر لیں۔ پر دیر تک صاحب خوشی خوشی ہٹول واپس آئے۔ ایک گھنٹہ بعد وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹیڑپ کے کھیتوں کی جگہ صفا چٹ میدان پڑا ہے۔ کچھ دیر پہلے جہاں کئی کئی فرلانگ تک پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا اب وہاں محض چند گز جگہ میں پھول باقی رہ گئے ہیں۔ اُس اللہ کے بندے نے ایک گھنٹے میں ہی سارے کھیت کاٹ کر پھینک دیئے۔ اس سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ لوگ کس برق رفتاری سے کام کرتے ہیں۔

ایک ہفتے بعد ہم بذریعہ ٹرین بحری جہاز کے ذریعے بیگ سے لندن کے لیے روانہ ہو گئے۔

لندن

آپ شاید یہ سن کر حیران ہو رہے ہوں گے کہ بذریعہ ٹرین مگر بحری جہاز کے ذریعے سفر کا کیا مطلب ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ ہالینڈ نے انگلستان جانے کے لیے رُودبار انگلستان کو عبور کرنا پڑتا ہے اور یہ سفر ”فیری“ کے ذریعے طے کیا جاتا ہے۔ مسافر انگلستان کے ساحل پر پہنچ کر دوبارہ ٹرین میں سوار ہو جاتے ہیں۔ رُودبار انگلستان کو عبور کرنے کے لیے فرانس اور ہالینڈ وغیرہ سے فیری کے ذریعے بحری سفر خاصا مقبول اور نسبتاً آرازاں ہے۔ جو لوگ ذاتی کاروں کے ذریعے سفر کرتے ہیں وہ بھی فیری ہی استعمال کرتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ آپ اپنی کار لے کر فیری میں داخل ہو جائیں اور اگر چاہیں تو سفر کے دوران کار ہی میں بیٹھ رہیں۔ دوسرے ساحل پر پہنچ

کھانے کے سلسلے میں ایک بات اور سن لیجئے۔ اداکارہ شبنم کے شوہر میوزک ڈائریکٹر روبن گھوش بھی یونٹ کے ہمراہ تھے۔ ان کی غربیہ بیوہ ہے کہ وہ جس شہر میں بھی جاتے پیدل گھومتے پھرتے اور کہیں نہ کہیں دیسی کھانے کا ہٹل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ پیرس میں بھی انھوں نے انتہائی دُور دراز علاقے میں ایک تندور نما ریٹوراں دریافت کر لیا تھا جہاں چاول اور دال دستیاب تھی مگر مرغ سے بھی زیادہ منگی۔ بیگ میں وہ خالص دیسی کھانا تو تلاش نہیں کر سکے مگر ایک ریٹوراں میں ایسی ڈش دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے جو دیکھنے میں پلاؤ اور ذائقے میں مسود کی دال کی طرح تھی۔ خدا جانے اس کا نام کیا تھا۔ پیرس میں بھی کھانے کی پرابلم ہی رہی تھی۔ اکثر تو ہم آلیٹ اور مکھن ٹوسٹ پر ہی گزارہ کرتے رہے۔ مگر پیرس کا ایک رواج ہمیں بہت پسند آیا۔ پیرس میں روٹیاں لمبی لمبی ڈنڈوں کی شکل کی ہوتی ہیں۔ انھیں ٹکڑوں میں کاٹ کر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم پہلی بار ایک ریٹوراں میں گئے تو دیکھا کہ میز پر ایک ٹوکری میں روٹی کے ٹکڑے اور ایک پیالی میں مکھن رکھا ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ نے جس کھانے کا آرڈر دیا ہے جب تک وہ تیار ہو اس دوران میں آپ روٹی مکھن چکھتے رہیں۔ ہم نے بھی چکھی اور انتہائی خوش ذائقہ لگی۔ ہمارے ساتھیوں کی بھی یہی رائے تھی۔ نتیجہ یہ کہ جب تک کھانا آتے ہم نے ساری روٹی اور تمام مکھن چٹ کر لیا۔ ویٹریں آرڈر لے کر آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چکھنے والی روٹی اور مکھن غائب ہے۔ اس روٹی اور مکھن کا معاوضہ وصول نہیں کیا جاتا۔ ہمیں یہ سسٹم بے حد پسند آیا۔ پھر تو ہم نے معمول بنالیا کہ کھانے کا آرڈر تو برائے نام ہوتا مگر اس کے آتے آتے روٹی اور مکھن سے شکم سیر ہو جاتے۔

بیگ میں ہمارا قیام ایک ہفتے کے قریب رہا۔ موسم ٹھنڈا ضرور تھا لیکن دھوپ نکلی رہی۔ گھومنے پھرنے کا لطف بھی آیا اور شوٹنگ کی رفتار بھی تیز رہی۔ ایک

تصویر اتار رہے تھے، ناچ گانے میں مصروف تھے۔ ایک صاحب کھڑے چند نوجوانوں کو رُودبار انگلستان کی تاریخ بتا رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ انگلستان دالوں کے دفاع کے لیے یہ تلخ ہمیشہ بہت کام آتی رہی ہے۔ ہمارا سمندر کا خوف دُور ہو چکا تھا اور ہم واقعی سمندری سفر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اچانک دو خوش حال لڑکیوں نے ”ایکسیکوزمی“ کہہ کر ہمیں چونکا دیا اور ایک عدد کیمبرہ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے اتنا س کی کہ ہم ان دونوں کی تصویریں بنادیں ہم نے فوراً یہ خوشگوار فریضہ ادا کیا، جواب میں انھوں نے ہمیں کافی پلائی۔ ان میں سے ایک امریکی تھی اور دوسری ناروے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ”فری“ کے سفر میں ملاقات ہوتی تو دونوں میں دوستی ہو گئی۔ دونوں نے پہلے تو ایکلی تصاویر بنائیں اور پھر دونوں کی یکجا تصویریں بنانے کے لیے ہماری خدمات حاصل کیں۔ بعد میں دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ امریکی لڑکی کراچی کا سفر بھی کر چکی تھی اور اس شہر میں اسے سب سے زیادہ جو چیز بھاتی وہ اونٹ تھا۔

”اور گدھا گاڑی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ ہم نے پوچھا۔
کہنے لگی۔

”ہاں وہ بھی اچھی چیز ہے مگر میں نے اس میں سواری نہیں کی۔ یہ بتائیے کہ آپ لوگ خواہ مخواہ ایک گدھے کو خالق کیوں کرتے ہیں؟
ان کا اشارہ گدھے کی پنج کی طرف تھا جو محض تکلفاً گدھے کے ساتھ چلتا ہے، حالانکہ گاڑی صرف ایک گدھا کھینچتا ہے۔
ہم نے کہا۔

”دجیر یہ ہے کہ ہمارے ہاں گدھوں کی کمی نہیں ہے اس لیے ایک ایڈیشنل گدھا پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر گدھا گاڑی کے گدھے کو فراہم کر دیا جاتا ہے۔ دھل

کر آپ کی کار فری سے باہر نکل جائے گی اور آپ پھر اپنے سفر پر کامزن ہو جائیں گے۔

”فری“ خاصی آرام دہ اور خوبصورت تھی۔ یوں سمجھئے چھوٹے سائز کا بحری جہاز تھا۔ آسائش اور آرام کی ہر چیز اس میں مہیا تھی۔ یہ قریباً ساڑھے چار پانچ گھنٹے کا سفر تھا۔ فری میں سیلینگ برتھ کا بھی بندوبست ہوتا ہے۔ اگر کوئی سونا یا آرام کرنا چاہے تو معمولی سی اضافی رقم دے کر سیلینگ برتھ بھی لے لے اور اپنی مرضی کے مطابق تھمتے جاگتے سفر طے کر لے۔ مگر عموماً سفر اس قدر دلچسپ اور خوبصورت ہوتا ہے کہ سونے کو کس کا فکر کا دل چاہتا ہے اور عام طور پر لوگ عرشے پر، ریسٹوران میں یا ڈیوٹی فری شاپ میں ہی وقت گزارتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ سفر اس لیے بھی دلچسپ اور ہیجان خیز تھا کہ یہ ہمارا پہلا بحری سفر تھا۔ اس سے پہلے ہم نے کسی تالاب یا جھیل میں بھی کشتی رانی نہیں کی تھی۔ دجیر اس کی یہ ہے کہ پانی سے ہمیں بہت ڈر لگتا ہے۔ چھوٹے ندی نالوں کی تو بات ہی کیا ہے۔ اگر باتھ ٹب بھی قدرے بڑے سائز کا ہو اور پانی سے بالاب بھرا ہوا ہو تو ہم اس میں قدم دھرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ پھر یہ تو باقاعدہ سمندر تھا۔ کچھ دیر تو ہم ڈرے اور سہنے رہے مگر پھر سمندر کی تازہ اور فرحت بخش ہوا اور ماحول کی رنگینی نے طبیعت میں جولانی پیدا کر دی۔ مسافروں کی بہت بڑی اکثریت یوروپین خواتین اور مردوں پر مشتمل تھی جن میں زیادہ تعداد سیاحوں کی تھی۔ یورپ کے بیشتر ملکوں کے لوگ انگریزوں کے مقابلے میں زیادہ ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوتے ہیں اور سیر و سیاحت کے دوران میں تو بڑے سے بڑا خشک طبیعت اور بد مزاج شخص بھی ماحول کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور ہنسی کھیل میں شریک ہو جاتا ہے چنانچہ نوجوان، ادھیڑ عمر اور بوڑھے جوڑے فری میں اٹھکیاں کرتے پھر رہے تھے۔

سے روپیہ سمیٹ کر لے جاتے تھے۔ فیری بندرگاہ میں ٹکڑا انداز ہو گئی اور ہم سب نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ اس مختصر سفر میں کافی لوگ ایک دوسرے کے شناسا بن گئے تھے۔ امریکی لڑکی نے نہ صرف ہم سے ہاتھ ملایا بلکہ... خیر رہنے ہی دیتے تھے۔

سرزمین انگلستان

بندرگاہ کے راستوں سے گزر کر ہم ٹرین تک پہنچ گئے جو ہماری منزل تھی۔ یہ انگلستان کی سرزمین پر ہمارا پہلا درود تھا۔ درمیان میں ایک جگہ پاسپورٹ اور ویزا بھی چیک کیا گیا۔ ڈین ہیگ سے فیری میں سوار ہوتے وقت بھی امیگریشن والوں نے پاسپورٹ اور ویزا چیک کیے تھے۔ انگلستان کی ٹرین میں سوار ہوتے تو یہ ہمیں فرانس کی ٹرین سے زیادہ مختلف نظر نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ فرانس کی ٹرینوں میں نفاست اور نزاکت قدرے زیادہ تھی۔ اس سے قطع نظر کوئی اور قابل ذکر فرق نہ تھا۔ ہم نے یارخاں کے ساتھ بطور خاص اس ٹرین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مطالعاتی سفر کیا اور ڈائننگ کار میں پہنچ گئے۔ یارخاں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگے اور ہم نے جاتے اور سینڈویچ کے لیے کاؤنٹر کا رخ کیا۔ ایک گورے ویٹر نے خالص انگریزی لہجے میں ہم سے پوچھا۔

”میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

ظاہر ہے چلتے کافی دینے کے سوا وہ اور کیا کر سکتا تھا۔ ہم نے دو کافی لانے کی فرمائش کی اور وہ غائب ہو گیا۔ ہم کاؤنٹر پر کھڑے رہے۔ اتنی دیر میں ایک اور انگریز مسافر آکر ہمارے بازو میں کھڑا ہو گیا۔ اندر سے ایک اور ویٹر نے برآمد ہو کر ان صاحب سے پوچھا۔

یہ بھی گدھوں کو بے وقوف بنانے کی ایک ترکیب ہے۔ گاڑی کھینچنے والا گدھا بھی سمجھتا ہے کہ سارا بوجھ صرف اسی کے کندھوں پر نہیں ہے بلکہ دوسرا گدھا بھی اس کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ حالانکہ دوسرا صرف مول سپورٹ دینے کے لیے تیار ہے۔“

گمردہ کافی چھٹی قسم کی لڑکی تھی۔ کہنے لگی۔

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ محض ایک گدھے کو بے وقوف بنانے کے لیے آپ دوسرے گدھے کو بلاوجہ ضائع کر دیتے ہیں۔ یا تو دوسرے کو بھی گاڑی میں لگا دیں یا پھر ایک ہی گدھے سے کام چلائیں۔ آخر دُنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی تو ہر جگہ صرف ایک گدھا ہی سارے کام کرتا ہے!“

ہم لاجواب ہو گئے مگر جب غور کیا تو سوچا کہ واقعی یہ کیا گدھا پن ہے؟ اسے ہم ایک گدھے کی فضول خرچی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے اس اہم نکتے کی طرف توجہ دلانے پر حسینہ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم تمہارے یہ جذبات کراچی کے گدھوں تک پہنچا دیں گے۔ ہم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ گدھا کیا چیز ہے ہم تو انسانوں کو بھی جے دریغ ضائع کر دیتے ہیں۔

جب سمندر کے پانی پر سفید برف جیسے پرندے اڑتے ہوئے نظر آنے لگے تو نتیجہ چلا کہ اب زمین نزدیک ہے۔ یہ پرندے صرف خشکی کے آس پاس ہی پائے جاتے ہیں، اور واقعی کچھ دیر بعد انگلستان کی سرزمین بھی نظر آنے لگی۔ صدیوں پہلے جب انگریز تاجروں نے سوداگری کی غرض سے ہندوستان کی سرزمین کا رخ کیا ہو گا تو انہیں بھی اسی طرح زمین کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہوگی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم ان کے ملک میں رہ کر اپنی گرہ سے پیسے خرچ کرنے آتے تھے جب کہ وہ ہندوستان

”فرمائیے۔ کوئی خدمت؟“

انھوں نے انگوٹھے سے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ مجھ سے پہلے آتے ہیں۔“

ہم تو اس نظم و ضبط، شائستگی اور خوش اخلاقی پر فریفتہ ہو گئے۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہمارا آرڈر ہو چکا ہے۔ تب کہیں جا کر اس نے اپنا آرڈر دیا۔ یہ انگلستان میں ہمارا پہلا اخلاقی تجربہ تھا۔ انگلستان اور یورپ بھر میں یہ رواج ہے کہ اگر صرف دو آدمی بھی کہیں منتظر ہوں گے تو ایک دوسرے کے پیچھے قطار بنا کر کھڑے ہوں گے اور کبھی دوسرے کی حق تلفی نہیں کریں گے۔ ان لوگوں میں قطار بنانے کی عادت اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ بقول یارخاں کے اگر قطار میں کھڑا ہونے کے لیے دوسرا آدمی نہ آجائے تو وہ اس کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ تو مبالغہ ہے مگر ان لوگوں کی قطار بندی، صبر و تحمل اور برداشت کی عادت واقعی قابلِ تعریف اور قابلِ تقلید ہے۔

اس ٹرین میں زیادہ مسافر انگریز تھے اس لیے نسبتاً خاموشی زیادہ تھی یہ قوم بولنے کے معاملے میں بہت کفایت سے کام لیتی ہے اور یورپ کے دوسرے ملکوں (اور امریکہ) کے برعکس یہ زیادہ ہنس مکھ بھی نہیں ہوتے۔ پاس سے گزرنے والوں کو دیکھ کر مسکرانے کی جگہ اکثر محض سر ہلانے پر اکتفا کرتے ہیں اکثر تو ایسا بھی نہیں کرتے۔ ٹرینوں اور دوسرے پبلک مقامات پر آپ یا تو لوگوں کو اخبار یا کتاب کے مطالعے میں غرق پائیں گے یا وہ اپنی ناک کی سیدھ میں خاموش ٹھیکلی لگاتے بیٹھے خلاہ میں دیکھتے ہوتے ملیں گے۔ آپ بالکل ان کے سامنے ہوں پھر بھی وہ آپ سے نظر نہیں ملائیں گے کہ مبادا مسکرائے یا بات کرنا ہی نہ پڑ جائے۔ اس کے مقابلے میں فرانس اور ہالینڈ میں لوگ ایک دوسرے سے نہ صرف گفتگو کر لیتے ہیں بلکہ ہنستے بولتے بھی ہیں۔ ٹیلی ویژن کے زمانے میں بھی یورپ اور انگلستان میں مطالعے کا

شوق بے پناہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخباروں کی اشاعتیں بہت زیادہ ہیں اور کتابیں بھی لاکھوں کی تعداد میں بکتی ہیں۔

ٹرین نے ہمیں لندن کے وکٹوریہ سٹیشن پر پہنچا دیا۔ یہ انتہائی وسیع اور صرف سٹیشن ہے۔ بیرون ملک کے لیے بیشتر ٹرینیں یہیں سے چلتی ہیں اور مسافر بھی یہیں آتے ہیں۔ اس لیے پناہ، ہجوم ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اس کے باوجود شور و غل اور بد نظمی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ ہم اس سٹیشن کو دیکھ کر زیادہ حیران نہیں ہوتے کیونکہ اس سے پہلے اٹلی، فرانس اور ہالینڈ کے ریلوے سٹیشن بھی دیکھے چکے تھے۔ انداز سب کا ایک ہی ہے۔ سوائے اس کے کہ انگلستان میں زیادہ تر لوگ انگریزی بولتے ہوئے ملتے ہیں جس کی وجہ سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہر جگہ سائین بھی انگریزی میں ہی لکھے ہوتے ہیں اور اکثر تو اسی انداز سے لکھے جاتے ہیں جیسے ہمارے ملک میں ہوتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو۔ ہمارے ملک میں بھی تو یہ سب انگریزوں ہی کا کیا دھرا ہے۔ انھوں نے اُسی طرز پر یہاں بھی سب کام کیے اور تقریرات کیں جس انداز میں ان کے اپنے ملک میں ہوتا ہے۔

پلیٹ فارم سے باہر نکلے اور ٹیکسوں کے لیے کھڑے ہو گئے۔ دیکھا کہ ٹیکسیاں گزری چلی جا رہی ہیں۔ ہمارے اشاروں اور ٹیکسی ٹیکسی“ پکارنے پر کوئی نہیں رکتا۔ راشد صاحب ناراض ہو کر بولے۔

”دیکھا آپ نے۔ کس قدر مستعجب اور احساسِ برتری کی ماری ہوئی

قوم ہے۔ ایشیائی لوگوں کو تو گھاس ہی نہیں ڈالتے یہ لوگ۔“

حالانکہ بعد میں پتہ چلا کہ ہمیں گھاس نہ ڈالنے کی وجہ ہماری رنگت نہیں تھی بلکہ یہ تھی کہ ہم ٹیکسی کے لیے قطار میں کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ یہاں ریلوے سٹیشن اور دوسرے مقامات پر رواج یہ ہے کہ مسافر قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ٹیکسی آتی

ہے اور سب سے آگے کھڑے ہوتے لوگوں کو سمیٹ کر لے جاتی ہے۔

یہ رات کا وقت تھا مگر ہر طرف روشنیوں کی افراط کے باعث دن نکلا ہوا تھا۔ کم از کم ہمیں ایسا ہی لگا۔ سوال یہ تھا کہ اتنی رات گئے ہوٹل کہاں اور کیسے تلاش کریں، یہاں تو ہالینڈ کے دی۔ وی۔ وی کے نمونے کا کوئی ادارہ بھی نہیں تھا۔ جو ہماری مشکل آسان کرتا۔ مگر راشد صاحب کو کسی نے یہ گھر کی بات بتائی تھی کہ اگر سیاحوں کے موسم ہیں ایڈوانس بکنگ کے بغیر لندن جاتیں تو آنکھیں بند کر کے وٹس کوٹر کے رائل ہوٹل پہنچ جاتیں۔ وہاں تھوڑے بہت انتظار کے بعد کمرہ ضرور مل جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ اطمینان سے کوئی دوسرا ہوٹل تلاش کر لیں۔ گویا رائل ہوٹل پیرلکائن کی جگہ ہے۔ چنانچہ ہم لوگوں کا قافلہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ واقعی بے حد لحیم شمیم ہوٹل ہے۔ ہزاروں کمرے ہیں مگر ملحقہ بانڈروم نہیں ہیں۔ اس ہوٹل کی لابی میں چوبیس گھنٹے سینکڑوں مسافروں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بیشمار لوگ ہوٹل سے رخصت ہوتے رہتے ہیں اور آتے رہتے ہیں۔ ہوٹل کی لابی کیا ہے اچھا خاصا شہر ہے۔ حسب توقع کمرے خالی نہیں تھے مگر خاتون نے ہمیں نمبر دے کر وسیع و عریض لاؤنج میں تشریف فرما ہونے کو کہا۔ ہم وہاں بیٹھ کر سیر دیکھنے لگے یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا بھر میں ہسپوں کا کلچر بہت عروج پر تھا۔ یہاں بھی کافی تعداد میں ہسپوں لڑکے اور لڑکیاں نظر آتے۔ دوسرے مسافروں کی تعداد بھی کم نہیں تھی مختلف ملکوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے مرد اور عورتیں ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ یہ بذات خود ایک تفریح ہے۔ کچھ دیر بعد ہم سب کو کمرے مل گئے۔ کمروں میں سامان رکھنے کے فوراً بعد ہم نے آس پاس کا علاقہ دیکھنے کا قصد کیا۔ ہوٹل سے نکل کر مڑک پر آئے۔ سامنے ایک ایشیائی قسم کے صاحب بہادر آ رہے تھے۔ ہم نے بڑی مصفا اور مسیح انگریزی میں ان سے پوچھا کہ اس علاقے کا اندر گراؤنڈ ٹسٹیشن کہاں

انہوں نے ایک نظر ہمیں دیکھا اور پھر اُردو میں بولے، دیکھیے۔ آپ سامنے جا کر باتیں ہاتھ مڑ جائیے۔۔۔۔۔ پھر یکایک انہیں خیال آیا کہ وہ ہم سے اُردو بولنے لگے ہیں تو رک گئے اور باقی فقرہ انگریزی میں ادا کرنے لگے۔ ہم نے فوراً کہا "نہیں نہیں۔ اُردو ہی میں بات کیجئے۔"

وہ مسکراتے اور بتا کر رخصت ہو گئے۔ لندن کے بارے میں یہ ہمارا پہلا تاثر تھا۔ کہاں تو یورپ کے وہ شہر جہاں ہمارا کوئی ہم زبان ڈھونڈنے سے نہیں ملتا تھا۔ اور ہم انگریزی بولنے والے کے لیے ترس جاتے تھے اور کہاں یہ ملک جہاں پہلے ہی ملاقاتی نے ہماری اپنی قومی زبان میں ہم سے بات شروع کر دی۔ بعد میں لندن (اور انگلستان کے اکثر مقامات) کی یہ خصوصیت ہمیں بہت بھاتی۔ یہاں ہر جگہ آپ کو اُردو پنجابی بولنے والے مل جاتے ہیں۔ اگلے چند سالوں میں تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ لندن میں انگریزی بولنے والوں کے مقابلے میں اُردو، پنجابی بولنے والے زیادہ ملتے ہیں۔ آپ کسی بھی جگہ چلے جاتیں کسی نہ کسی گوشے سے آپ کو ان زبانوں میں باتیں کرنے والوں کی آواز سنائی دے جاتے گی۔ لندن میں ہر شے جانی بچانی اور دیکھی دیکھی سی لگتی ہے۔ اجنبیت اور نامانوسیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بعض علاقے تو ایسے ہیں کہ اگر ہمارے ہی ملک کے علاقوں کو زیادہ صاف اور منظم کر دیں تو کوئی فرق ہی محسوس نہ ہو۔ بلکہ بعض شہروں کے بعض علاقوں میں تو یہ فرق بھی باقی نہیں رہتا۔ خالص ایشیائیوں کے علاقوں میں ہو بہو وہی نقشہ نظر آتا ہے جو ہمارے اپنے ملک میں ہے۔ ہمیں یہ معلوم کر کے بھی بہت حیرت ہوتی کہ لندن اور انگلستان کے بعض شہروں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو پندرہ بیس سال سے وہاں مقیم ہیں پھر بھی انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے۔ محض "یس اور نو" سے کام چلاتے ہیں۔ اول

تو عموماً ان کا انگریزوں سے واسطہ ہی نہیں پڑتا۔ یا پھر انگریز ان کی اردو اور پنجابی آمیز انگریزی سمجھ لیتے ہیں۔

تھوڑی دُور ٹہلنے کے بعد ہم واپس ہوٹل آکر سو گئے۔ صبح اُٹھے تو غسل خانے کی کمی محسوس ہوئی۔ ہاتھ منہ دھونے کے لیے ہر کمرے میں بیسن تو ہوتا ہے مگر نہانے اور دوسرے کاموں کے لیے کامن بائتھ روم کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ ہم چونکہ دیر میں بیدار ہوتے تھے اس لیے تمام غسل خانے قریب قریب فارغ ہی تھے اور قطار بندی کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر جگہ اُچلے تو لیے اور صابن موجود تھے۔ صفائی ایسی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ اتنے ڈھیر سارے لوگ اس غسل خانے کو استعمال کر چکے ہیں۔ ایک خاتون نے نمودار ہو کر ہم سے پوچھا کہ کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ ہم نے شکریہ ادا کر دیا۔ نیچے اُترے کھانے کے مختلف وسیع کمروں میں سینکڑوں لوگوں کے لیے ناشتے کا اہتمام تھا۔ یورپ کے ہوٹلوں میں ناشتے کے لیے وقت مقرر ہوتا ہے۔ مقررہ وقت کے بعد ناشتہ دستیاب نہیں ہوتا۔ راتل ہوٹل میں کیونکہ ہزاروں مسافروں کا جھوم ہوتا ہے اس لیے یہاں ناشتے کا وقت گیارہ بجے تک تھا۔ ورنہ عام طور پر نو ساڑھے نو بجے تک ناشتے کا وقت ہے ہوتا ہے۔ اس کے بعد معذرت۔

راتل ہوٹل کے نزدیک ہی فلیٹ سٹریٹ واقع ہے جو اخباری صنعت کا مرکز ہے "اخبار وطن" کا دفتر بھی وہیں ایک گلی میں تھا۔ ہم "مشرق" کے چیف ایڈیٹر غایت اللہ صاحب سے ملاقات کی غرض سے "اخبار وطن" کے دفتر پہنچے تو دیکھا کہ چند حضرات جاتیاں لینے اور پان کھانے میں مصروف تھے۔ یہ ماحول دیکھ کر ہمیں انگریزی بولنے کی جرات ہی نہیں ہوئی۔ اُردو میں ہم نے ان سے غایت صاحب کے بارے میں دریافت کیا اور ٹھیکٹ پنجابی میں انہوں نے ہمیں مطلع کیا کہ وہ اس وقت راتل ہوٹل کے چھوٹے ریسٹورنٹ میں ہیں گے۔ دراصل غایت صاحب دن میں دفتر کی جگہ

راتل ہوٹل کے ریسٹوران میں ہی بیٹھک کیا کرتے تھے۔ ہم واپس ہوٹل کے چھوٹے ریسٹوران میں گئے تو ایک کونے میں دُور ہی سے غایت صاحب بیٹھے ہوتے نظر آ گئے۔ ان کے ارد گرد چھ سات حضرات تشریف فرما تھے اور گپ شپ چل رہی تھی وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ بغیر ہوتے اور شکایت کی کہ پہلے سے انہیں کیوں خبر نہیں دی۔ اس کے بعد انہوں نے چچے سے پیالی کو بجا کر ایک لمبی ترنگی دیڑیس کو مخاطب کیا۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی تو بولے۔

"ایلی۔ دن کپ فارماتی فریڈ۔"

ایلی سر ہلا کر مسکراتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ چند لمحے بعد واپس آئی اُس نے پانی کا ایک گلاس بھر کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور پھر چائے لینے چلی گئی۔ یہ نکاح پاکستان کے چائے خانوں اور کافی ہاؤسوں کا طریقہ ہے جہاں عموماً صبحانی اور دانشور صبح سے شام تک بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں رواج یہ ہے کہ اگر چائے کا آرڈر دیں تو بیراپلے ایک پانی کا گلاس لا کر رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد چائے یا کافی لاکے آتا ہے۔ غایت صاحب نے راتل ہوٹل کے ریسٹوران کو بھی ٹھیکٹ لاہوری ماحول میں رنگ لیا تھا۔ ہم نے ان کے اس کارنامے پر غایت صاحب کو مبارکباد بھی دی۔ پھر ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ عرصے پیرس اور روم جاکر بھی قیام کریں اور وہاں کے ریسٹوران والوں کی عادتیں بھی "ٹھیک" کر دیں۔ ایلی چائے لے کر آئی ہم سے اُردو میں پوچھنے لگی۔

"کتنی چینی؟"

ہم حیران ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگے۔ تھی تو واقعی میم مگر اچھے خاصے لمحے میں اُردو بول رہی تھی۔ غایت صاحب ہنسے اور کہنے لگے۔

"حیران نہ ہوں، یہ تو پنجابی بھی بولتی ہے"

ذلیفہ ملتا ہے۔

چنانچہ ہمارے بے شمار لوگ کوئی کام کاج نہیں کرتے۔ گھر بیٹھے ذلیفہ وصول کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ چوری چھپے دسی لوگوں کے پاس نوکری وغیرہ بھی کر لیتے ہیں جس کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ کہ نہ صرف انگریز کے خزانے سے ہفتہ وار ذلیفہ وصول کرتے ہیں بلکہ ٹیکس بجا کر بھی خزانے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہاں یہ منظر عام ہے کہ شادی کو آٹھ سال ہوتے ہیں اور گھر میں پانچ بچے شور مچا رہے ہیں۔ پوچھا۔

”بھائی۔ خدا کا خوف نہیں کرتے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

جواب ملا۔

”اجی۔ اس کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ ہر بچے کی پیدائش پر حکومت سے ذلیفہ ملتا ہے۔ زچگی، تعلیم، علاج معالجہ سب مفت ہے۔ تو پھر خاندانی منصوبہ بندی کی کیا ضرورت ہے؟“

یعنی وہی انتقامی جذبہ۔ اس سے متاثر ہو کر ہم نے فلم ”دوستی“ میں ایک کردار تخلیق کیا جو ساقی صاحب نے بہت خوبصورتی سے ادا کیا۔ یہ صاحب لندن میں نرس بازی کرتے ہیں اور بڑے صغیر سے آنے والے سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا آٹو سیدھا کرتے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ دکانوں میں جلتے ہیں تو چیزیں چُر کر جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ ایک موقع پر ان کا ایک پاکستانی دوست ان کے ساتھ شاپنگ سنٹر میں جاتا ہے۔ دونوں گھر واپس آتے ہیں تو ساقی صاحب اپنے اوپر کوٹ کے اندر سے بے شمار سامان نکال کر ڈھیر لگا دیتے ہیں جو وہ چوری کر کے لاتے ہیں۔ دوست حیران ہو کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

انگریز اور ہم

سچ تو یہ ہے کہ اس کے بعد پھر ہم لندن اور انگلستان کے دوران قیام میں کسی بات پر حیران نہیں ہوتے (ایک زمانہ تھا جب انگریزوں نے ہمارے ملک پر دھاوا بول دیا تھا۔ مگر اب اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ اُن کے ملک پر ایشیائی لوگوں نے یلغار کر دی ہے۔ وہ بے چارے تو ہندوستان میں گنتی میں بہت کم تھے۔ ہمارے ایشیائی بھائیوں کی تعداد اب وہاں لاکھوں میں پہنچ گئی ہے اور جس تیز رفتاری سے یہ آبادی میں اضافہ کر رہے ہیں اس کے پیش نظر انگریزوں کو ڈر ہے کہ آئندہ بیس سال میں ان کے ملک میں مقامی باشندوں کی تعداد کم ہو جاتے گی اور وہ اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ پھر ہم ایشیائی (بھائی، پاکستانی، بنگلہ دیشی) لوگوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آس پاس کے ماحول کا اثر بالکل قبول نہیں کرتے۔ اپنی عادات تبدیل کرنے پر بالکل آمادہ نہیں ہوتے۔ لندن میں ہم نے پاکستانی اور ہندوستانی بھائیوں کو خالص دسی انداز میں رہتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہاں کی تیز، تہذیب اور ادب آداب سے وہ لوگ متاثر ہیں اور آج بھی اپنے پُرانے دنگ ڈھنگ اپناتے ہوتے ہیں۔ وہی بد نظمی، گندگی، شور و غل، دھکم پیل لڑائی جھگڑے۔ انگریز بے چارے پریشان ہونے میں حق بجانب ہیں۔ ان کی قوت برداشت واقعی تعریف کے قابل ہے ورنہ ہمارے لوگ وہاں جس انداز سے رہتے ہیں اسے انگریز تو کیا ہمارے گلیگ میں رہنے والے بھی شاید برداشت نہ کر پاتیں۔

ہم نے غور کیا، سوالات کیے، تجزیہ کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ ایک طرح کا انتقام سے جواشفتہ، مانند انگریزوں سے لے رہے ہیں۔ مثلاً وہاں

”تھیں شرم نہیں آتی۔ اتنا بہت سامان چُرا کر لے آتے ہو؟“
 ساتی صاحب ڈھٹائی سے جواب دیتے ہیں۔
 ”شرم کس بات کی؟ اس قوم نے بھی تو، بیس برسوں تک لوٹا ہے
 ہم نے تھوڑا بہت ہاتھ صاف کر لیا تو کیا بُرائی ہے؟“

انگلستان کے بارے میں اس وقت تک پاکستان میں رہنے والوں کو اصل
 حالات کا علم نہیں تھا۔ سب یہ سمجھتے تھے کہ جو شخص وہاں کام کے لیے جاتا ہے عیش کی
 زندگی گزارتا ہے۔ بے شمار روپیہ کما تا ہے۔ کاروں میں گھومتا ہے۔ عالیشان مکانوں
 میں رہتا ہے۔ وہاں سے واپس آنے والے بھی اہل وطن کو اپنے عیش و عشرت
 کی فرضی داستانیں سنایا کرتے تھے۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔ خاص
 طور پر ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے دیہاتیوں کی زندگی تو عذاب ہی تھی۔ وہاں یہ لوگ
 سخت مشقت اور محنت مزدوری کر کے بہت کم پیسے کمایا کرتے تھے جس میں سے ایک
 بڑا حصہ انھیں اپنے اُن ہم وطنوں کے حوالے کرنا پڑتا تھا جو انھیں ملازمت دلاتے
 تھے۔ وہ لوگ انھیں بھیڑ بکریوں کی طرح کمروں میں رکھتے تھے۔ ایک ایک کمرے میں
 بیس بیس فرد رہا کرتے تھے اور ان کی رات اور دن کی علیحدہ علیحدہ باری ہوا کرتی
 تھی۔ رات کو کام پر جانے والے دن میں اور دن میں کام کرنے والے رات کو فرش
 پر ایک ہی بستر استعمال کیا کرتے تھے۔ پھر ان کی نوکری کی کوئی ضمانت بھی نہیں تھی۔
 قصہ مختصر یہ کہ بہت مصیبت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ادھر وطن میں ان کے
 دوست اور رشتے دار یہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے لندن میں جا کر دنیا کی تمام نعمتیں
 حاصل کر لی ہیں۔ میں نے ان لوگوں کے روز و شب بھی فلم میں دکھائے جس کی وجہ
 سے یہ فلم سمندر پار بنائی جانے والی ہندوستانی اور پاکستانی فلموں میں موضوع اور
 حقیقت کی عکاسی کے اعتبار سے پہلی اور انوکھی فلم بن گئی۔ یہ تو عام لوگوں کا حال

تھا، جو لوگ وہاں قسمت کی مہربانی اور محنت کے بدلے پر دولت مند ہو گئے تھے وہ
 معاشرتی مسائل میں گرفتار تھے۔ جن لوگوں نے جوش جوش جوانی میں انگریز عورتوں سے
 شادی کر لی تھی۔ جوانی کا اُبال ختم ہونے اور اولاد کی پیدائش کے بعد وہ اب خون
 کے آنسو رو رہے تھے۔ اس قسم کے کرواروں کو بھی بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ
 ”دستی“ میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر میں نے بھی انگلستان کے بارے میں یہ کہانی لاہور
 میں بیٹھ کر لکھ دی ہوتی تو شاید یہ بھی دوسری فلموں کی طرح ایک عام خیالی اور
 فرضی کہانی بن کر رہ جاتی۔

انگلستان کے پہلے ہی دورے میں مجھے یہ احساس ہوا کہ ہندوستانی اور پاکستانی
 گھرانے مادی دولت اور جدید سہولتوں سے فیض یاب ہونے کے باوجود اس ماحول
 میں خود کو اجنبی اور غیر مانوس محسوس کرتے ہیں اور اپنے عاجلانہ فیصلے پر پچھتا رہے
 ہیں۔ ان کی اولاد کی پرالیم اور بھی زیادہ ہے۔ انھیں مغربی ماحول میں پرورش پانے
 کا موقع ملتا ہے مگر گھر کی چار دیواری کے اندر ماں باپ انھیں خالص پاکستانی دیکھنا
 چاہتے ہیں اور مشرقی اقدار کے مطابق ان کی پرورش کرنے کے خواہش مند ہیں،
 جو بچوں کے لیے انتہائی حیران کن اور ناقابل عمل صورت حال ہے۔ ان کی ایک
 اور پرالیم یہ ہے کہ وہ دوسری شخصیت کے مالک بن جاتے ہیں اور شدید احساس
 کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ انگلستان میں انھیں غیر یورپین اور ایشیائی سمجھ کر
 ان سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے جبکہ اپنے باپ دادا کے ملک کے طور
 طریقوں اور ماحول سے ناواقف ہونے کی بنا پر یہاں بھی انھیں اجنبی ہی تصور کیا جاتا
 ہے۔ وہ ان دونوں جہانوں میں سے کسی ایک کے بھی نہیں رہتے۔ میں نے بعد میں
 یورپ، امریکہ، کناڈا وغیرہ کے بے شمار سفر کیے اور ہر قسم کے پاکستانیوں سے ملاقات
 کا موقع ملا۔ میں نے ان میں سے ۹۹ فیصد کو اپنے وطن واپس جانے کی آرزو میں

مبتلا دیکھا۔ مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے وطن واپس چلے جائیں تو وہ زندگی کیسے گزاریں گے۔ اور جس معیار زندگی کے وہ عادی ہو چکے ہیں وہ انہیں وطن میں کیونکر حاصل ہو سکے گا؟ مغرب میں رہنے والے پاکستانیوں کو وطن واپس آنے کی چاہت بھی بہت ہے مگر راہ میں مشکلات بھی کم نہیں ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہاں وہ جس قدر اوپر کما رہے ہیں (بعض مخصوص اور محدودے چند لوگوں کے علاوہ) اس کا دسواں حصہ بھی پاکستان میں نہیں کما سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں ملازمتوں اور کاروبار کے ذرائع بہت محدود ہیں اور جو میسر بھی ہیں تو وہ صلاحیت اور حقوق کی بنیادوں پر نہیں ملتے بلکہ سفارش، قربت داری یا رشوت و اثر و رسوخ کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ ملازمت پلشیہ لوگوں کی ایک اور مشکل بھی ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں اور ایسے علوم میں مہارت حاصل کرتے ہیں جن کی ترقی یافتہ ملکوں میں بہت قدر ہونی چاہیے لیکن ہمارے ملک میں کوئی انہیں پوچھتا بھی نہیں۔ انہیں معاوضے بہت کم دیے جاتے ہیں اور اکثر اوقات انہیں ان کے مخصوص شعبوں میں کام کرنے کی سہولت حاصل نہیں ہوتی۔ میں ایسے بہت سے ڈاکٹروں، انجینئروں اور سائنس دانوں کو جانتا ہوں جو وطن کی محبت میں ہر خیر قربان کر کے واپس آگئے مگر انہیں نظر انداز کیا گیا اور ان مخصوص شعبوں میں استعمال نہیں کیا گیا جن میں انہوں نے مہارت حاصل کی تھی۔ ان باتوں کے علاوہ ایک اور مسئلہ رہن رہن اور طرز زندگی کا بھی ہے۔ مغربی ممالک میں روزمرہ زندگی بہت سکون سے گزرتی ہے جبکہ ہمارے معاشرے میں روزمرہ ہزاروں بلاوجہ کی مصیبتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہاں پیدا ہونے والے کم سن بچے تو خیر اس فرق کو بہت ہی زیادہ محسوس کرتے ہیں مگر وہاں چند سال گزارنے والے لوگ بھی اپنے معاشرے کی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کا سامنا کرتے ہوئے بہت پریشانی محسوس کرتے

ہیں۔ ہمارا پورا نظام بدقسمتی سے بدعنوانیوں، لاپرواہیوں، بے عملیوں اور کاہلی کا شکار ہو چکا ہے۔ ہر کام میں رکاوٹ ہے۔ ہر دفتری کام ایک مرحلہ ہے۔ جبکہ مغرب میں دفتری کام اور روزمرہ کی عام ضروریات کسی پریشانی یا تردد کے بغیر ہی حل ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ پاکستان واپس آتے مگر یہاں کے حالات اور غیر صحت منداحول سے تنگ آکر واپس لوٹ گئے۔ میں نے بے شمار ایسے دولت مند اور کامیاب پاکستانی دیکھے ہیں جو وہاں دولت میں کھیل رہے ہیں مگر پھر بھی ان کا بس نہیں چلتا کہ پُر لگ جائیں اور وہ اپنے وطن واپس چلے جائیں۔ وہ ہر دم وطن کی سرزمین ہی کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور واپسی کے لیے قسم قسم کے منصوبے بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی خوشحالی، خوش باشی اور آسائش کے باوجود مجھے ان کی ذاتی زندگی اُلم اور محرومی کی داستان ہی نظر آتی۔ اور ان کی آئندہ نسلوں کے لیے کاتب تقدیر نے کیا لکھ دیا ہے؟ اس کا تصور ہی روح فرسا اور تکلیف دہ ہے۔ کاش ہم اپنے ملک میں وطن کے ان فرزندوں کی واپسی کے لیے بہتر حالات اور سازگار ماحول پیدا کر سکتے۔

لندن میں دو دن راتل ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد ہم پکاڈلی سرکس کے ایک ہوٹل میں منتقل ہو گئے۔ پکاڈلی سرکس لندن کی رگ جاں ہے۔ بے شمار سڑکیں یہاں آکر ملتے ہیں۔ لندن کے بہترین شاپنگ سنٹر اس کے آس پاس واقع ہیں۔ ہوٹل، کلب، دوکانیں، ریستوراں، تھیٹر، سینما غرض ہر قابل ذکر اور قابل دید چیز پکاڈلی کے گرد و نواح میں موجود ہے۔ لندن پہنچتے ہی پہلی حاضری پکاڈلی سرکس میں دی جاتی ہے اور اس کے نواح میں گھومتے ہوئے آپ کو بے شمار شناسا چہرے نظر آ جاتے ہیں۔ سیاحوں کا یہ بہت بڑا مرکز ہے۔ ہر طرف سیاحوں کا ازدحام رہتا ہے۔ رات اور دن ہر وقت یہی صورت حال دیکھنے میں آتی ہے۔ پکاڈلی کے بچوں بیچ

کلاسیکی راگوں کی طرح رفتہ رفتہ دل میں اتر جاتا ہے۔ سچ پوچھتے تو ہمیں سارے شہروں سے زیادہ لندن ہی بھاتا ہے اور یہیں رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پہلے پہلے ہانے لندن میں قیام ضرور کیا کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ یہاں زیادہ سے زیادہ عرصہ گزاریں۔ لندن میں اگر آپ پیرس والی چمک دمک اور نفاست تلاش کریں گے تو مایوسی ہوگی۔ عمارتیں دھوئیں سے کالی یا کاتی سے مہزی مائل۔ عمارتیں بھی بہت زیادہ جدید اور خوبصورت بھی نہیں ہیں۔ لیکن اس شہر کے پُرانے پن میں بھی ایک رکھ رکھاؤ اور حُسن ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا شہر ہے۔ انگریزوں نے دُنیا بھر پر حکمرانی کی اور سارے جہاں کی دولت سمیٹ کر لندن لے گئے لندن کے درد دیوار آج بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ظاہری حُسن، دلکشی اور چمک دمک سے محروم ہونے کے باوجود لندن ایک تاریخی شہر ہے۔ پُر شکوہ، عالیشان اور شاندار، یورپ کے جدید شہروں، خصوصاً امریکہ اور کناڈا کے شہروں کے مقابلے میں لندن ایسا ہی لگتا ہے جیسے گلبرگ کی جدید ترین کوٹھی کے مقابلے میں شالیار یا شاہی قلعہ، اس کا رُعب داب اور وقار ہی الگ ہے۔ پھر انگریزوں نے اپنے اکثر آداب و رسوم کو بھی نہیں چھوڑا ہے اور اس قدامت پسندی نے لندن کو ایک نرالی شان بخش دی ہے۔

کاروبار، تجارت کے اعتبار سے یہ ساہما سال تک دُنیا کے مغرب کا اعصابی مرکز رہا ہے اور آج بھی ہے، آرٹ، سائنس، فنونِ لطیفہ، سائنس، ٹیکنالوجی، اقتصادیات، علوم غرض ہر شعبے میں لندن کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ نظامِ رنگینوں اور غنائیوں سے محروم ہونے کے باوجود یہ ایک بھرپور اور مرحوب گُن شہر ہے۔ آبادی کی کثرت کے باوجود یہاں ہجوم اور افراتفری کا احساس نہیں ہوتا نہ ہی بد نظمی کا درد دورہ ہے۔ زندگی ایک خاص نظم و ضبط کے تحت بسر کی جاتی ہے۔ لندن کی سڑکیں دُنیا کے جدید شہروں کے مقابلے میں بہت تنگ ہیں بلکہ ہمارے کراچی اور لندن کی بیشتر سڑکیں لندن

ایک چھوٹے سے باغ میں کبوتروں اور سیاحوں کا مجمع رہتا ہے۔ جن دنوں ہم وہاں گئے ہپتوں کا درد دورہ تھا اور لندن دراصل ہپتوں کے قبضے میں تھا۔ جس جگہ دیکھتے مختلف قوموں، ملکوں اور نسلوں کے ہپتی لڑکے اور لڑکیاں گھومتے ہوتے نظر آجاتے تھے۔ ہم نے پہلی بار ”ہرے کرشنا، ہرے راما“ تحریک کے پیروکاروں کا جلوس بھی دیکھا۔ سفید فام لڑکے سر منڈاتے اور ہندوؤں کی طرح سر پر لمبی لمبی چوٹیاں بناتے جلوس کی صورت میں جا رہے تھے۔ یورپین لڑکیاں بھی ہندو جوگنوں کے لباس میں ہمراہ تھیں۔ وہ اشوک وغیرہ بھی گاتے رہتے تھے مگر خالص انگریزی لبِ دلچے میں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو مذہب نے ساری دُنیا کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا خاص طور پر مغربی اقوام اپنی مادیت اور بے سکونی سے تنگ آکر روحانی سکون کی تلاش میں ہندو مذہب کے جوگیوں اور رشیوں کی آغوش میں پناہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ بہر حال لندن میں اگر آپ نے پکا ڈلی سرکس نہیں دیکھا تو سمجھیے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ ہمیں یہ آسانی تھی کہ جب چاہے شاپنگ کی، گھومے پھرے اور ہوٹل میں جا کر آرام کر لیا۔ لندن کا پکا ڈلی سرکس واقعی اپنی نوعیت کی انوکھی چیز ہے۔

لندن ہوشِ مبعثالتے ہی ہمارے خوابوں کا شہر بن گیا تھا۔ اس کے بارے میں شروع ہی سے اتنا کچھ سنا، پڑھا، تصویروں اور فلموں میں دیکھا کہ یہاں کی ہر چیز اور ہر جگہ سے مانوس ہو گئے۔ لندن کا کوئی علاقہ اور کوئی قابلِ ذکر عمارت ایسی نہیں تھی جس کے بارے میں ہم جانتے نہ ہوں۔ مگر جب انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اتنی دلکش اور خوبصورت نہیں لگیں جتنی تصویروں، فلموں یا تصور میں نظر آتی تھیں۔ لندن ایک خوبصورت شہر ہے مگر انگریزوں نے دُنیا بھر میں اسے یوں ضربِ المثل بنا کر پیش کیا ہے اور اس کے بارے میں اتنے مبالغے سے کام لیا ہے کہ جب اصل لندن کو دیکھو تو شروع شروع میں مایوسی ہونے لگتی ہے۔ مگر پھر یہ شہر

کی سڑکوں سے زیادہ کشادہ ہیں۔ لیکن بہتر ٹریفک کے اصولوں کی بناء پر لندن میں ٹریفک انتہائی ہموار اور سبک رفتار ہے اور ہر دم رواں دواں رہتا ہے۔ میں نے کبھی ان سڑکوں پر بے ربطی اور ہڑبواگ کا عالم نہیں دیکھا۔

۱۹۷۰ء کا لندن (بکہ سارا انگلستان) باقی یورپ کے مقابلے میں بے حد ارزاں تھا۔ یورپ کی خاک چھاننے کے بعد جب ہم نے لندن کی انواع و اقسام کے مال و اسباب سے لبریز دکانیں اور نسبتاً حد سے زیادہ سستی قیمتیں دیکھیں تو یوں لگا جیسے ساری دنیا بے چارے انگریزوں کو لوٹ رہی ہے۔ لندن ہمیشہ سے خریداری کا پسندیدہ مرکز اور خریداروں کی جنت رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شاپنگ کا جو لطف لندن میں آتا ہے وہ کسی اور شہر میں کہاں۔ ہم نے اس سے پہلے روم۔ پیرس اور ڈین ہیگ کے بازار بھی دیکھے اور بعد میں دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی گئے مگر لندن کے بازاروں میں ہجوم اور خریداروں کی وارفتگی کا جیسا عالم کہیں اور نہیں دیکھا۔ یہاں شاپنگ سینٹروں اور بازاروں ہر دم ہجوم رہتا ہے۔ فٹ پاتھوں، دوکانوں اور سڑکوں پر خریداروں کے اڈھام اور کھوے سے کھوا اچھٹا دیکھا تو ہم ششدر رہ گئے۔ لوگ بے تحاشہ اور بے اندازہ شاپنگ کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے آج ان کی زندگی کا یا خریداری کا آخری دن ہے۔ پھر اس کے بعد یہ موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔ دوکانوں میں اشیاء کی فروانی اور تنوع بھی قابل دید ہے۔ اس زمانے میں لندن واقعی سارے یورپ سے زیادہ ارزاں تھا۔ کھانے پینے کے سامان اور ٹرانسپورٹ سے لے کر سامانِ تفریح تک ہر چیز بے حد سستی اور آسانی سے دستیاب تھی۔ اُن دنوں یورپ کے دوسرے ملکوں سے لوگ خریداری کے لیے لندن آیا کرتے تھے۔ دو تین دن قیام کرتے، سامان خریدتے، سیر و سیاحت کرتے اور چلے جاتے۔ اس کے باوجود یہ سودا انھیں سستا پڑتا تھا۔ ہمارے ملاقات ایک نوبیا تاجر جرمن جوڑے سے ہوئی۔ یہ میاں بیوی فریج خریدنے کے لیے

لندن آتے ہوتے تھے۔

ہم نے پوچھا۔

”کیا جرمنی میں اچھا فریج نہیں ملتا؟“

جواب ملا۔

”مگر تو ہے مگر لندن میں درستی زیادہ ہے اور قیمتیں بہت کم ہیں۔ ہم نے دو تین دن یہاں ہوٹل میں قیام کیا، سیر تفریح کی۔ ہوائی جہاز کا کرایہ ادا کیا، فریج خریدا پھر بھی جرمنی کے مقابلے میں خرچہ زیادہ نہیں ہوا۔ اور ہنری مون ہمیں مفت میں پڑ گیا۔“

مگر پھر رفتہ رفتہ لندن کو بھی نہ جلنے کس کی نظر لگ گئی۔ خصوصاً یورپین کامن مارکیٹ میں شامل ہونے کے بعد انگلستان میں بھی اشیاء کی قیمتیں بڑھتے بڑھتے دوسرے ملکوں کے برابر ہو گئیں۔ آج کا لندن بھی ”گرانی گرانی“ چلا رہا ہے۔ ہم جیسے لوگ جب وہاں جاتے ہیں تو ہر چیز کی منگائی دیکھ کر پُرانے زمانے یاد کر کے آہیں بھر کر رہ جاتے ہیں۔ اس زمانے میں لندن میں ہوٹل بھی بہت سستے تھے۔ کئی سال تک ہم وہاں جاتے تو مختلف ہوٹلوں میں بھی قیام کرتے اور لطف اٹھاتے۔ اکثر تو ہم سوچا کرتے تھے کہ یہ انگریز ہوٹل والے اس قدر کم پیسے وصول کرنے کے باوجود زندہ کیوں کر رہتے ہیں۔ ایک بار ہم اپنی فلم کی کہانی لکھنے کی غرض سے برمنگھم کے ایک پُر سکون ہوٹل میں قیام پذیر ہوئے۔ یوں تو ہم بیگم کے ساتھ ایک دوست کے آرام دہ گھر میں مقیم تھے مگر ہمیں چند روز کے لیے خاموشی، سکون اور تنہائی کی ضرورت تھی۔ ہمارے دوست کئی دن برمنگھم کے نواح کی خاک چھاننے رہے آخر ایک دن خبر لاتے کہ بی بی سی کے عقب میں ایک ہوٹل مل گیا ہے جو آپ کی خواہش کے عین مطابق ہے۔ ہوٹل دیکھنے گئے تو واقعی بہت خوبصورت اور پُر سکون تھا۔ تیس چالیس کمروں پر

مستقل بہت آرام دہ کمرے اور سرکس بھی لاجواب۔ کسی قسم کا شور و غل دُور دور تک نہیں تھا۔ اس ہوٹل کو تین بہنیں چلاتی تھیں اور غالباً تینوں ہی غیر شادی شدہ اور خوش شکل تھیں۔ گویا ایک اور اضافی خوبی! اس ہوٹل میں ایک رواج ہم نے یہ دیکھا کہ شام کو لاونچ میں ٹرائیوں میں چلتے۔ کافی۔ جوس۔ دودھ۔ اڈولین بسکٹ۔ پنیر وغیرہ بھی رکھ دیا جاتا تھا۔ مہمان ٹیلی ویژن دیکھتے رہیں اور کھاتے پیتے وقت گزاریں۔ لطف یہ کہ اس کے عوض قیمت وصول نہیں کی جاتی تھی۔

ہم اس ہوٹل میں آٹھ دس دن مقیم رہے رات کو دپتہ تک لکھتے رہے۔ صبح دیر سے اُٹھے۔ تیار ہو کر باہر نکلے تو گیارہ بجے تھے۔ ہم دفتری نوٹس بورڈ پڑھنے لگے جس پر لکھا تھا کہ ناشتہ کا وقت ساڑھے نو بجے تک ہے۔ اتنے میں تین میں سے ایک مالکہ مسکراتی ہوئی دفتر سے نکل کر آئیں اور پوچھا۔

”کسی چیز کی ضرورت ہے آپ کو؟“

ہم نے کہا۔

”ضرورت تو ہے مگر بل نہیں سکے گی؟“

بولیں :

”کیا چاہتے؟“

ہم نے کہا۔

”ناشتہ، مگر...“

کہنے لگیں :

”کوئی بات نہیں۔ آپ ڈائننگ ہال میں چلتے ناشتہ میں کیا پسند کریں گے؟“

ہم نے فوراً مکمل ناشتہ کا آرڈر دے دیا اور انھوں نے تازہ تباڑہ گرامرگم ناشتہ ہمارے سامنے لا کر رکھ دیا، اور حیرت کی بات یہ کہ چہرے پر کوئی ناراضی

بھی نہیں۔ مسکرا مسکرا کر ہمیں دیکھتی رہیں۔ ہم نے ناشتہ کیا اور پھر کمرے میں بند ہو گئے۔ یہ کمرہ بہت آرام دہ تھا۔ ہاتھ روم میں سفید قالین بچھے ہوتے تھے۔ شیشو، صابن اور آفٹر شیو بھی موجود تھا۔

پانچ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوتی۔ ہم نے دیکھا تو ان تینوں بہنوں میں سے ایک عدد بہن کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ بولیں :

”آپ نے لونچ بھی نہیں کھایا۔ میں نے سوچا مجھو کے ہوں گے۔ چائے،

ٹوسٹ اور سینڈویچ لے آتی ہوں۔ پسند کریں گے؟“

ظاہر ہے ہم پسند کیوں نہ کرتے۔ چائے بے حد پر لطف تھی۔ نو دس بجے تک ہم پھر مصروف رہے اور پھر لاونچ میں جا کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ اس بار تیسری بہن ہماری خاطر داری کے لیے موجود تھیں۔ بولیں۔

”آپ شاید ڈرنک تو نہیں کرتے۔ آپ کے لیے اڈولین بنا دوں؟“

ہم نے فوراً سر تسلیم خم کر دیا۔

ہمارے قیام کے دوران میں ہی معمول رہا کہ ہم گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کمرے سے نکلے تو ایک بہن ہمارے لیے ناشتہ لگا دیتیں اور پانچ بجے بلا طلب کیے دستک دے کر چلتے اور لوازمات لے آتیں۔ رات کو دودھ اڈولین یا دودھ اور ہاٹ چاکلیٹ سے خاطر کی جاتی۔ اس طرح آٹھ نو دن گزر گئے اور ہمارا کام ختم ہو گیا۔ بل دینے گئے تو معلوم ہوا کہ روزانہ کرایہ چار پونڈ ہے (جو اس زمانے میں پاکستانی سو روپے بھی نہیں بنتے تھے) مگر ہمارے ساتھ خاص رعایت ہے۔ صرف ساڑھے تین پونڈ روزانہ کے حساب سے وصول کیے جائیں گے شام کی چائے اور سینڈویچ کے عوض کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ رات کی خاطر تو سبھی کے لیے فری تھی۔ ہم نے بل ادا

ہم سوچتے رہ گئے۔ کہاں بزرگکم کی وہ ہوٹل والیاں اور کہاں ہمارے ملک کے ہوٹل والے۔ یہاں تو اگر ہوٹل والوں کو ہوا بھی لگ جاتے کہ مہمان کا تعلق لکھنے لکھانے سے ہے تو وہ اس فکر میں رہتا ہے کہ جلد سے جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرے۔ شاید مغرب اور مشرق میں یہی بنیادی فرق ہے۔



کیا۔ تینوں بہنیں مسکراتی ہوتی کار تک آئیں۔ ہماری پیروی سے بھی ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہیں اور ہم سے درخواست کی کہ دوبارہ پھر آئیے گا۔ ہم بہت دیر تک اس خاطر داری کے نشے میں مہریش رہے اور سوچتے رہے کہ شاید تینوں کی تینوں نے ہمیں پسند کر لیا ہے۔ ورنہ اس قدر خصوصی مراعات کیوں دی جاتیں؟

شام کو ہم نے اپنے دوست سے کہا :
 ”بھاتی۔ کیا بات ہے کہ انھوں نے ہم سے بلا طلب کیے اتنی رعایت کر دی اور پھر ہمارے کئے بغیر ہر شام ہمیں چلاتے اور سینڈویچ بھی مفت میں خود ہی لا کر کھلاتی رہیں۔ سب سے حیرت کی بات یہ کہ گیارہ بارہ بجے بھی ہمیں مسکراتے ہوئے ناشتہ دے دیا کرتی تھیں حالانکہ اس محلے میں بعض ہوٹلوں میں ہمارا فساد ہوتے ہوتے رہ گیا مگر نو ساڑھے نو بجے کے بعد ناشتہ نہیں مل سکا۔ اب یہ بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے؟ کیسے وہ ہم پر عاشق وغیرہ تو نہیں ہو گئیں؟“

ہمارے دوست بہت زور سے ہنسے۔ کافی دیر تک ہنستے رہے۔ پھر بولے
 ”آفاقی صاحب! دراصل بات یہ ہے کہ جب میں نے ان سے آپ کے لیے کمرے کی بات کی تھی تو انھیں بتایا تھا کہ مجھے اپنے راتر دوست کے لیے کمرہ چاہیے۔ وہ بے حد نازک مزاج اور سکون پسند ہے۔ کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور کہا :

”ہماری خوش قسمتی کہ ایک ادیب ہمارے ہوٹل میں رہنا پسند کرے گا۔“

چنانچہ یہ ساری مراعات اور ساری مہربانیاں اسی لیے تھیں۔

نہیں آتا جو یورپ کے دوسرے نسبتاً کم مصروف ہوائی اڈوں پر دیکھنے میں آتا ہے اعداد و شمار کے مطابق ہر ایک منٹ کے بعد اس ایئر پورٹ پر کوئی جہاز آتا یا یہاں سے روانہ ہوتا ہے۔ ہر روز ناشتے اور رات کے کھانے کے درمیان ایک لاکھ کے لگ بھگ مسافر ہیتھرو ایئر پورٹ کو اپنے قدموں سے رونق بخشتے ہیں جو لوگ انھیں خوش آمدید کہنے آتے ہیں یا جو عملہ ایئر پورٹ پر کام کرتا ہے وہ ان کے علاوہ ہے۔ پچھلے سال جو لاکھوں مسافر ہیتھرو ایئر پورٹ پر آتے ان میں سے ۵۵ لاکھ لندن میں قیام کرنے والے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ان ۵۵ لاکھ سیاحوں نے لندن میں قریب قریب ڈھائی ارب پونڈ خرچ کیے۔ یہ صرف وہ لوگ ہیں جو ہیتھرو ایئر پورٹ سے لندن آتے تھے۔ لندن کا دوسرا مصروف ایئر پورٹ گیٹ وک اس کے علاوہ ہے اور پھر دوسرے شہروں کے نواحی ایئر پورٹ بھی ہیں۔ ان کی مدد سے آپ لندن میں آنے والوں کی تعداد کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں (بحری جہازوں، کاروں سے آنے والے ان کے علاوہ ہیں) پچھلے سال ہیتھرو ایئر پورٹ پر مختلف بین الاقوامی ایئر لائنوں کے ذریعے ۲۳ کروڑ کے لگ بھگ مسافر آئے اور گیٹ وک کے ایئر پورٹ پر ایک کروڑ چالیس لاکھ مسافروں نے قدم رنج فرمایا اس اعتبار سے دیکھا جائے تو دنیا کا سب سے مصروف ترین ایئر پورٹ اور دنیا کا چوتھا مصروف ترین ایئر پورٹ دونوں لندن ہی میں ہیں، ان دونوں ہوائی اڈوں پر کروڑوں مسافر ہر سال آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ پچھلے موسم گرما میں ایک ہفتے میں اوسطاً دو ہزار چار سو جہازوں نے لندن سے مختلف شہروں کے لیے پرواز کی۔ یورپ میں ایسٹروٹم اور پیرس کے ایئر پورٹ کے منتقلین کو یہ فکر کھاتے جا رہے ہیں کہ بڑھتے ہوئے مسافروں سے نپٹنے کے لیے کچھ اور بھی کرنا چاہیے اس سلسلے میں ایک تجویز یہ بھی ہے کہ لندن کیلئے ایک اور ایئر پورٹ تعمیر کیا جائے درنہ ہیتھرو بہت زیادہ پُر ہجوم ہو جاتے گا۔

دو سال بعد پھر لندن

پی آئی اے کا ہوائی جہاز لندن ہیتھرو ایئر پورٹ پر اتر رہا ہے۔ فلائٹ حسب معمول بہت اچھی سبک اور آرام دہ رہی۔ پی آئی اے کے بارے میں ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ بعض اوقات یہ لوگ مسافروں کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتے ہیں۔ پروازوں میں تاخیر، ٹکٹوں میں مشکلات طرز عمل سے شکایت۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجموعی طور پر پاکستان کی قومی ایئر لائن کی کارکردگی قابل فخر ہے۔

میں اس بار قریب قریب دو سال بعد لندن آیا ہوں باہر پھوڑا پڑتی نظر آ رہی ہے یہ موسم سرما انگلستان میں قیامت خیز گزرا ہے۔ کہتے ہیں کہ پچھلے ۳۶ برسوں میں اتنی سردی اتنی بارش اتنی برف نہیں پڑی اور اس بات کا ثبوت بعد میں بھی فراہم ہو گیا۔ مٹی کی آمد آمد ہے اور سردی ہے کہ کم ہونے کا نام بھی نہیں لیتی۔ بعض علاقوں میں تو درجہ حرارت صفر سے بھی کم ہو گیا ہے۔ لندن میں بھی بعض راتیں انتہائی سرد گزریں۔ برف تو نہیں پڑی لیکن پانی کی سطح پر برف کی جھلی ضرور جم گئی۔ لیکن سردی ہو یا گرمی برف باری ہو یا بارش لندن کے ایئر پورٹ، خصوصاً ہیتھرو ایئر پورٹ یکساں طور پر مصروف رہتا ہے۔ ہیتھرو کو یورپ اور امریکہ کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ ہر روز بے شمار مسافر لندن سے امریکہ اور یورپ کے مختلف مقامات کے لیے روانہ ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر وہ بد نظمی نفسی اور ہجوم نظر

باہر نکلیں تو وہی پُرسکون اور خاموش ماحول ملے گا، گنتا ہی نہیں کہ یہ شہر لاکھوں کی آبادی رکھتا ہے نہ ٹریفک کا ہجوم اور شور نہ بسوں اور ٹیکسیوں کی ناراماری۔ بڑے سکون سے قطار میں کھڑی ہوتی ٹیکسیوں میں سے سب سے اگلی ٹیکسی میں سوار ہو جائیں اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں۔ رٹرکوں پر دیکھتے تو در سولے رکش اور ہجوم کے اوقات (کے) ٹریفک خاموش اور روانی سے رواں دواں نظر آتا ہے حالانکہ لندن کی آبادی ۶۲ لاکھ ہے ہر روز اس سے زیادہ تعداد میں لوگ گرد و نواح سے بھی آتے ہیں اور واپس جاتے ہیں۔

ایک دہائی پہلے جب انگلستان کی معیشت تباہ حال تھی لندن بھی اس بد حالی کا شکار ہو گیا۔ تجارت، صنعت و حرفت، کلچر ہر شعبے میں یہ دور ایک انحطاط کا دور تھا۔ دس سال پہلے لوگ کہتے تھے کہ لندن زندگی سے محروم ہو رہا ہے مر رہا ہے ہر طرف دیرانی اور بے رونق نظر آتی تھی دوکانیں خریداروں کے ہجوم سے محروم، ہر طرف اُداسی کا دور دورہ شراب خانے، کلب اور ریستورانٹ اجڑے ہوئے تاریخی عمارتوں کو دیکھتے تو میلی کچیل لندن کی غربت اور دیرانی میں اضافہ کرتی ہوتی۔ آرٹ اور کلچر کے شعبے میں بھی لندن پیچھے رہ گیا تھا فیشن کے معاملے میں پیرس اور سب سے بڑھ کر نیویارک لندن پر بازی لے جا چکا تھا بلکہ لندن والوں کو یہ احساس کمتری پیدا ہو گیا تھا کہ لندن کی جگہ اب نیویارک فیشن، تہذیب و ثقافت اور صنعت و تجارت کا مرکز بن گیا ہے دُنیا بھر کی تمام سرگرمیوں کا مرکز لندن سے ہٹ کر نیویارک بن گیا تھا پُرانے انگریز بڑی حسرت سے اپنے اچھے دنوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے اور آہیں بھر کر کہتے۔

”آہ لندن بھی ہماری سپاندگی کا شکار ہو گیا ہے۔“

یہ صورت حال ۱۹۷۵ء تک قائم رہی۔

انگریزوں سے آپ چاہے کتنا اختلاف کریں یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ یہ قوم

کسی بھی ملک کی اقتصادی صورت حال کا اندازہ کرنے کے لیے وہاں کے ایئر پورٹ بہترین بیرومیٹر ہوتے ہیں۔ مثلاً جب یورپ، انگلستان میں اقتصادی بد حالی کی لہر آتی تھی تو ایئر پورٹ کی رونق چھپکی پڑ گئی تھی۔ لیکن جب اقتصادی اور معاشی حالات سنبھلنے لگے تو اچانک ہیٹھرو ایئر پورٹ کی مصروفیت بدرجہا بڑھ گئی۔ صرف اچھے ایک سال کے اندر لندن کے ہیٹھرو پورٹ ٹریفک میں دس گنا اضافہ ہوا ہے۔

ہیٹھرو پر درجنوں ایسے مسافر بھی آتے ہیں جن کی شخصیت مشکوک ہوتی ہے۔ اسمگلنگ کے علاوہ غیر قانونی طور پر یا جعلی دستاویزات کے ذریعہ انگلستان آنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد ان میں شامل ہوتی ہے جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امیگریشن کا عملہ نہایت ہوشیاری لیکن بنیاد اخلاقی اور تہذیب سے کام لیتا ہے۔

جس روز ہم ہیٹھرو پہنچے اسی فلاحی سے ایک درمیانہ عمر کے صاحب بھی لندن پہنچے تھے ان کا کہنا تھا کہ ان کی منیجر لندن میں ہے اور وہ شادی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ دوسری طرف امیگریشن کا عملہ ان سے سوالات کر رہا تھا کہ کیا وہ واقعی منیجر ہیں؟ اور اس سے پہلے بھی ان کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں؟ ان کا کہنا تو یہی تھا کہ وہ کنوارے ہیں مگر ان کی عمر چالیس سال سے زائد تھی۔ دانشداعلم بالصواب امیگریشن کا عملہ یوں تو ساری دُنیا میں بہت ہوشیار ہوتا ہے لیکن لندن کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یہ لوگ قیافہ شناسی میں ماہر ہوتے ہیں۔ اکثر ایسے لوگ جو بنیاد ہر مشکوک نظر آتے ہیں اور جن کے پاس مناسب کاغذات بھی نہیں ہوتے ذرا سی دیر میں مطمئن ہونے کے بعد رخصت کر دیتے ہیں لیکن بعض معقول نظر آنے والے لوگ بھی ان کی عقابانی نظروں سے محفوظ نہیں رہتے۔ یہی حال کسٹم والوں کا ہے اگر آپ اس رات سے گزر رہے ہیں جہاں کسٹم نہیں ہوتا تو وہ آپ کو کچھ نہیں کہیں گے لیکن اگر کسی کے بارے میں شک جاتی تو اس کا سامان چیک کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ لندن ایئر پورٹ سے

جاگتا ثبوت آج کا لندن ہے۔ ۱۹۸۵ء کا لندن۔ لندن آج پھر تہذیب و تمدن کا گوارہ ہے۔ یہ پھر دنیا بھر میں جدید فیشن کا مرکز بن گیا ہے اور نیویارک کو اس نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے نقشے پر لندن ایک نئے اندازہ سے ابھرا ہے۔ یہاں کی موسیقی نے ایک بار پھر مغرب میں اپنے جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔ اسٹیج اور تھیٹر کی جو رونق نیویارک کے براڈوے پر سمٹ کر رہ گئی تھی۔ آج پھر لندن کے ویسٹ اینڈ کی زینت ہے۔ ویسٹ اینڈ کے تھیٹر تماشائیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک کامیاب اور خوبصورت ڈرامہ یہاں دکھایا جا رہا ہے اور مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر رہا ہے۔ گلزن روڈ کے کلب اور تھیٹر آج پھر زندگی کی حرارت سے معمور ہیں اور تو اور لندن کے ریٹورنٹ اور ہوٹل بھی اس خوشحال انقلاب کی زد میں آگئے ہیں۔ ریستورانوں میں قدم رکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ ہوٹلوں میں ہنگے دامن بھی کمرہ نہیں ملتا۔ نوادرات کے نیلام گھروں میں لاکھوں پونڈ کی بولی دینے والے لوگ ایک بار پھر نظر آنے لگے ہیں۔ پچھلے ہی دنوں "امریکہ کے پرنسوں" کے بارے میں ایک نادر کتاب جس میں مصنف نے اپنے ہاتھ سے داٹر کمر سے تصاویر بھی بنائی تھیں ایک سو سال کے بعد دس لاکھ پونڈ میں فروخت ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس دولت کی فراوانی ہے بیش قیمت سینگلز بھی لاکھوں پونڈ میں بک رہی ہیں اور خریدنے والوں کی کمی نہیں ہے یہ تو درست ہے کہ ابھی انگلستان اقتصادی مشکلات سے دوچار ہے اور بے روزگاری، غربت اور مسائل کا شکار بھی ہے لیکن کوئی کلام نہیں ہے کہ لندن آج ایک بار پھر یورپ کا دارالحکومت بن چکا ہے، یہ آج یورپ کا اعصابی مرکز ہے۔ ہر طرف گہما گہمی ترقی اور پیش قدمی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ تجارتی اور اقتصادی ترقی کا اندازہ یوں لگائیے کہ اس وقت لندن سے ۸۰ لاکھوں کے لیے براہ راست ٹیلیکس سروس دستیاب ہے۔ اگرچہ امریکہ اندرونی طور پر ٹیلی فون کے نظام کے سلسلے میں دنیا بھر میں سرفہرست ہے لیکن امریکہ کے بعد انگلستان دوسرا ملک ہے

نا قابلِ تسخیر ہے نہ ہٹ کر اٹھیں فتح کر سکا نہ پزیریں اور تو اور دوسری جنگ عالمگیر کے بعد کی اقتصادی تباہی نے انگلستان کی کمر ہمت نہ توڑی۔ جنگ کے بعد دوسرے ملکوں نے بھی بھالایا لیکن انگریزوں کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ نہ صرف وہ ایک تباہ کن اور خونریز جنگ سے گزرے تھے بلکہ انھیں ایک ایک کر کے اپنی نوآبادیوں سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تھے ایک وقت تھا جب سلطنتِ برطانیہ کی قلمرو میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا مگر جب برطانیہ کی قلمرو سمٹ کر انگلستان کے ساحلوں تک محدود رہ گئی تو اس سلطنت میں کئی کئی دن سورج طلوع نہیں ہوا کرتا تھا۔ جنگ جیتنے کے باوجود بریادی اور تباہی کا دور دورہ تھا۔ اوپر سے ستم یہ کہ نوآبادیوں کی لٹ کھسٹ سے جو دولت آتی تھی اس سے بھی رفتہ رفتہ محروم ہو گئے۔ بے شمار انگریز ملک سے باہر تجارت ہسخت اور ملازمتوں کے سلسلے میں برسرِ روزگار تھے مگر اب وہ بے روزگار ہو گئے۔ میں نے چندہ سولہ سال قبل خود کئی کمشنر اور اعلیٰ عہدے داروں کو لندن کی ٹیوب میں سفر کرتے ہوتے دیکھا یا بازاروں میں عام آدمیوں کی طرح گھومتے پایا۔ اللہ اللہ ایک وقت تھا کہ جب یہ ہندوستان کے قادرِ مطلق تھے۔ ہزاروں ہندوستانیوں کی زندگی اور موت کے مالک۔ لیکن تعریف کی بات یہ ہے کہ ان پسپائیوں اور محرومیوں نے اس قوم کا ذہنی توازن خراب نہیں کیا۔ انھوں نے عروج کے زمانے میں جس بلند نگاہی کا ثبوت دیا تھا۔ زوال کے دوران میں بھی اسی خندہ پیشانی اور مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ زندہ قومیں کبھی نہیں مرتیں۔

جی تو ذکر ہو رہا تھا لندن کا ۱۹۷۵ء تک یہ ملک اور شرِ زوال کا نوحہ خواں تھا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری مسلسل کوشش اور جدوجہد میں مصروف رہے، ایجادیں کیں، محنت کی، منصوبے بناتے اور ان پر عمل کیا کام کیا۔ یہاں تک کہ انگلستان زوال کے دور سے باہر نکل آیا۔ ۱۹۷۵ء کے بعد سے اس ملک نے جو ہمہ گیر ترقی کی اس کا جیتا

لندن کے شب و روز

لیکن اب لندن کے شب و روز کچھ بدل سے گئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب شام کو پانچ بجے کے بعد شہر بھر میں کوئی دکان کھلی ہوتی نہیں ملتی تھی۔ پانچ بجے اور دوکانوں نے شہر بند کر دیتے۔ اور تو اور پرچون اور جنرل مرچنٹس کی دوکانیں بھی بند ہو جاتی تھیں۔ اب اگر آپ کو کسی چیز کی اچانک ضرورت پڑ گئی تو مارے مارے پھرتے قیمت ہی ہے جو کوئی چیز مل جاتے اور پھر ویک اینڈ یعنی ہفتہ اتوار کو تو لندن کو سانپ ہنڈکھ جایا کرتا تھا۔ گلتا تھا شہر میں کر فیوگ گیا ہے یا کوئی جنگ چھڑ گئی ہے، کیا جال جو کوئی بھی دکان کھلی ہوتی مل جاتے۔ سڑکوں پر رونق یوں ہی کم ہو جاتی تھی۔ جن لوگوں کو شہر سے باہر ویک اینڈ گزارنے جانا ہوتا تھا وہ روانہ ہو جاتے تھے۔ باقی لوگ آرام سے گھروں میں بیٹھے کام کاج کرتے یا پھر عیش کرتے۔ — لندن میاؤں کی پہل پہل اور آمدورفت ساری رات رہا کرتی تھی یا پھر سینیا گھروں اور کلبوں وغیرہ میں رونق نظر آتی تھی۔ لیکن عام طور پر شہر ویران ہو جایا کرتا تھا۔

مگر اب ایسا نہیں ہے۔ شہر کے اکثر علاقوں میں دوکانیں سات آٹھ بجے تک کھلی رہتی ہیں۔ ریسٹورنٹ بھی رات گئے تک مصروف رہتے ہیں اور تو اور انگریزوں کی دوکانیں بھی آپ کو رات تک کھلی ہوتی مل جائیں گی۔ ہفتہ اور اتوار کو بھی کم از کم ایک دن بعض لوگ دوکانیں ضرور کھولتے ہیں۔ اس انقلاب کی وجہ کیا ہے؟ یہ دراصل ایشیائی لوگوں

جہاں دنیا بھر میں سب سے زیادہ ٹیلی فون ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں چھ سو ملین ٹیلی فون ہیں ان میں سے ۹۳ فیصد ٹیلی فون ڈائریکٹ ڈائلنگ کے ذریعہ لندن سے منسلک ہیں مصنوعی سیاروں کی مدد سے لندن دنیا کے ہر شہر سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ ٹوکیو جو دنیا بھر میں تجارت اور صنعت و حرفت کا بہت بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے وہ بھی دنیا کے سب سے ملکوں کو ٹیلیکس اور ٹیلی فون کے پیغامات بھیجنے کے لیے اپنے لندن کے مرکز کی مدد لیتا ہے کیونکہ یہ نسبتاً آسان اور ارزاں ہے۔ دنیا بھر کی تمام قابل ذکر اور بڑی کمپنیوں کے دفاتر اب لندن میں موجود ہیں یہاں تک کہ امریکہ کے بعض عظیم تجارتی ادارے بھی اپنے صدر دفتر لندن منتقل کرنے کی متعلق سوچ رہے ہیں۔

لندن کی یہ کایا پلٹ انگریز قوم کی ثابت قدمی مستقل مزاجی نظم اور مضبوط بندہ کی جیتا جاگتا ثبوت ہے۔



”صاحب حیرت کی بات ہے، انگریز لوگ تو کبھی شکایت نہیں کرتے۔“
یہ انگریز تو اس میدان میں بھی ہمیں شکست دینے پر تئیں ہوئے ہیں۔

لندن اب ریٹورانوں سے بھر پور شہر ہے۔ شہر کے کسی گوشے میں چلے جایئے
ریٹورانوں کی قطاریں نظر آئیں گی۔ اور نطف یہ ہے کہ انگریزوں نے اب بھی قسم
کے کھانوں کی سرپرستی شروع کر دی ہے۔ عربی کباب۔ ترکی کباب۔ پاکستانی شامی
کباب اور سیخ کباب۔ کوفتے اور پھر سب سے بڑھ کر پاکستانی ہندوستانی چٹ پٹے
کھانے۔ ان کے علاوہ ویٹ انڈین ریٹوران۔ چائینز ریٹوران۔ کورین ریٹوران
اطالوی ریٹوران۔ فرانسیسی ریٹوران۔ یونانی ریٹوران۔ جاپانی ریٹوران غرضیکہ
ہر ملک کے کھانے ہر ملک کے ریٹوران میں مل جاتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا کھانے
دالوں کی اکثریت انگریزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب بنت نئے ریٹوران کھلنے شروع
ہو گئے تو انگریزوں کو بھی مزہ پڑ گیا۔ اب انگریز بھی ریٹورانوں کی سرپرستی کرنے لگے ہیں،
رات گئے تک لندن کے ریٹورانوں میں چل پھل اور رونق رہتی ہے۔ انگریزوں کی
آمد رفت سے ریٹوران دالوں کو توفادہ ہوا ہی مگر کھانے والوں کو یہ نقصان ہو کہ اب
ان ہوٹلوں کا معیار بلند ہو چکا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ کھانے کی قیمت بھی بڑھ گئی ہے۔
یہی حال تھیٹر کا ہے۔ ۱۹۸۲ء تک لندن کے تھیٹر میں مندا تھا۔ بہت سے تھیٹروں
میں اندھیرا پڑا تھا۔ کبھی کبھار کوئی ڈرامہ ہو گیا اور بس۔ لیکن پچھلے تین سالوں میں
لندن کے تھیٹروں میں بھی زندگی لوٹ آتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام تھیٹر نہ صرف
مصرف ہو گئے ہیں بلکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا پہلے دیکھا جائے۔ تھیٹر
کا بزنس ایک بار پھر منافع بخش ہو گیا ہے اور خوب چل رہا ہے۔ یہی حال اوپیرا موسیقی
کے پروگراموں کا ہے۔ ویسٹ اینڈ کے تھیٹر ایک زمانہ میں میوزیکل ڈراموں کے لیے مشہور
تھے۔ بعد میں یہاں دیرانی ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ ایک میوزیکل ڈرامے پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ

کے قدموں کی برکت ہے۔ ہندوستانی، پاکستانی، چینی، کورین، فلپائن کے لوگ لندن
میں آتے تو انھیں پانچ بجے دوکان بند کرنا پسند نہ آیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی
دوکانیں اور کاروبار دیر تک کھولنے شروع کر دیئے۔ انگریزوں نے پہلے تو ناک بھوں
چڑھائی مگر بزنس آخر بزنس ہے۔ چند سال کے بعد اب انگریز دوکاندار بھی اسی روش
پر گامزن ہو گئے ہیں۔ اس وقت یہ عالم ہے کہ ہفتہ اتوار کو بھی آپ لندن میں
اپنی ضرورت کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔ ایشیائیوں کے مقابلے میں اب انگریزوں نے
بھی یہی اصول اپنا لیا ہے۔ ایشیائیوں خصوصاً بھارت اور پاکستان والوں نے
لندن کے مزاج کو تبدیل کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

مثلاً ریٹورانوں ہی کو دیکھ لیجئے لندن کے لوگ نہ تو ریٹورانٹ جانے کے
شیدائی تھے اور نہ ہی انھیں باہر کا کھانا پسند آتا تھا، بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی
تھی جو ریٹورانٹ میں کھانا کھانے کے عادی تھے مگر اب لندن دالوں کے کھانے پینے
کی عادتیں بھی بدل گئی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ ہوا کہ لندن میں نت نئے ریٹوران
کھلنے شروع ہو گئے، ایشیائی کھانوں کے لیے ہندوستانی اور پاکستانیوں نے ریٹورانٹ
کھولے۔ یہاں پہلے تو بھارتی اور پاکستانی تیار کھانے کے لیے آتے تھے مگر رفتہ رفتہ
دسی کھانوں کا مزہ انگریزوں کو بھی پڑ گیا، اب یہ حالت ہے کہ پاکستانی اور ہندوستانی
ریٹورانوں میں اکثریت انگریزوں کی نظر آتے گی اور مزے کی بات یہ ہے کہ انھوں
سے آنسو رواں ہیں، مرچوں کی تیزی کی وجہ سے سونہو کرنے جا رہے ہیں مگر کھانے
سے باز نہیں آتے۔ بعض ریٹورانوں میں چینی اتنی تیز ہوتی ہیں کہ مجھ سے نہیں کھاتی
گئیں، شکایت کرنے پر ویٹرنے بتایا کہ صاحب مرچیں تو بہت مناسب ہیں۔

”ازے بھائی۔ ہم سے تو کھاتی نہیں جا رہی ہیں“

وہ مسکرایا۔

پرنڈن کا ہر کار والا ۳۰ پونڈ ۸ پینس دیتا ہے۔ جس میں سے سڑکوں کی اصلاح پر صرف ایک پونڈ خرچ کیا جاتا ہے۔ آخر باقی رقم کہاں چلی جاتی ہے؟ یہ صورت حال اس لیے بھی قابلِ غور ہے کہ لندن میں کاروں کی تعداد میں ہر سال تین فیصد کی رفتار سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اب کار والوں کو یہ خوش خبری سنائی گئی ہے کہ سال رواں میں انہیں زیادہ روڈ ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ کار والے یہ کہتے ہیں کہ صاحبِ لندن میں کار چلانا دشوار ہو گیا ہے اب حکومت کی طرف سے ان کی روک تھام کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے مگر حکومت کار والوں کو کار چلانے سے تو نہیں روک سکتی۔ لوگوں کا معیارِ زندگی بلند ہو رہا ہے۔ پھر وہ کاریں خریدیں گے ہی۔ اور جب خریدیں گے تو چلائیں گے بھی۔ اس کا ایک علاج تو یہ ہے کہ پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم کو مزید بہتر بنایا جلتے تاکہ لوگ کاروں کو استعمال کرنے کے گھنچھٹ میں ہی نہ پڑیں لیکن آخر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ لندن میں ٹرینوں۔ ٹیوبوں اور بسوں ٹیکسیوں کی تعداد پہلے ہی حد سے زیادہ ہے تو پھر اس کا حل کیا ہے؟ ہم اپنی روڈ پرالیم حل کرنے کے لیے لندن ٹرانسپورٹ سے ماہرین بلاتے رہے ہیں اب لندن والوں کو چاہیے کہ وہ قیمتی مشورے حاصل کرنے کے لیے ہمارے ماہرین کو بلا لیں۔ جس کے بعد نہ بانس رہے گا نہ بانسری۔

لندن کی بلکہ لندن کے کار والوں کی سب سے بڑی مشکل کاروں کا بجوم اور سڑکوں کا پتلا ہونا ہے۔ صبح کے وقت اور شام کو لندن کی سڑکوں پر ٹریفک کا وہ بجوم ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ پچھلے چند سالوں میں کاروں کی رفتار اور کم ہو گئی ہے، یوں سمجھتے کہ ریسٹریکٹ ہوتی چلتی ہیں۔ صبح کے مقابلے میں شام کو بجوم زیادہ ہوتا ہے۔ لندن میں شام کے وقت کوئی بھی شخص اوسطاً ۱۵ تا ۲۰ میل کی رفتار سے زیادہ تیز کار چلا ہی نہیں سکتا، بسوں کا حال اس سے بھی خراب ہے کیونکہ بسوں کو تو برا اسٹاپ پر رُک کر مسافروں کو اتارنا اور سوار کرنا بھی ہوتا ہے۔ بسوں کے مسافروں کو چلایے

پونڈ لاگت آتی ہے اور آمدنی اتنی نہیں تھی۔ مگر اب میوزیکل ڈرامے ایک بار پھر مقبول ہو رہے ہیں۔ یہی حال کامیڈی اور سنجیدہ ڈراموں کا ہے۔ ڈراموں کی کامیابی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اداکار جو اسٹیج سے مایوس ہو کر فلموں میں چلے گئے تھے اب دوبارہ تھیٹر کی طرف آ رہے ہیں۔ دراصل تھیٹر کے اداکار جو مزا اسٹیج پر آتا ہے وہ فلم یا ٹیلی ویژن میں کہاں؟ لندن بے شمار تھیٹروں کا شہر ہے۔ اتنے کہ کتنے بیٹھیں تو تھک جائیں۔ لندن والوں کی پہلی پسند تھیٹر ہی رہی ہے۔ نہ جانے کیوں پچھلے چند سالوں میں اچھے ڈرامے پیش نہیں کیے جاسکے مگر اب اسٹیج پر نئی زندگی پیدا ہو گئی ہے۔

لاہور اور کراچی کی خراب، ٹوٹی پھوٹی سڑکوں کے ہم سب عادی ہیں اور شاکی بھی آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ لندن والوں کو بھی یہی شکایت ہے۔ کار والوں کا کہنا ہے کہ ان سے جو بھاری ٹیکس وصول کیے جاتے ہیں وہ سڑکوں کی اصلاح اور مرمت پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ لندن شہر میں کاروں کی تعداد ۶۲ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ وہ کاریں جو گرد و نواح سے ہر روز آتی ہیں اور لندن کی سڑکوں پر دوڑتی پھرتی ہیں ان کی تعداد بھی ان سے کچھ کم نہیں ہے۔ سڑکیں تپتی ہیں، کیونکہ یہ ایک قدیم شہر ہے اس لیے بہت سے لوگ تو اپنی کاروں کو استعمال ہی نہیں کرتے۔ ٹرین۔ ٹیوب یا بسوں کے ذریعہ سفر کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک اندازے کے مطابق اگر کسی ایک دن سب لندن والے اپنی کاروں کو سڑکوں پر نکال لائیں تو سڑکوں پر کوئی ایک کار بھی حرکت نہیں کر سکے گی۔ روڈ ٹیکس کا حساب یہ ہے کہ پچھلے سال ایکسائز ڈیوٹی ٹیکس اور پٹرول ٹیکس کی مدد سے لندن کے کار مالکوں نے حکومت کو ایک ارب دو کروڑ پونڈ دیئے ہیں پاکستانی روپے میں اس کا حساب خود لگا لیجئے) اندازہ ہے کہ لندن میں ہر کار کا مالک سال میں اوسطاً ۶۱ پونڈ حکومت کو ادا کرتا ہے۔ مگر کار والوں کو شکایت ہے کہ اس خیر رقم میں سے صرف ۳۱ پونڈ سڑکوں کی بہتری پر صرف کیے جاتے ہیں۔ روڈ ٹیکس کے طور

ملک میں بھی بہت شکایتیں ہیں خیر ہمارے ملک کے بس کے مسافروں کے عذاب کا تو دنیا میں کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا مگر لندن میں بھی جن اوقات میں رکش ہوتا ہے بے چارے بس مسافر خاصی شکل میں گرفتار ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک سردے کے مطابق اگر کوئی شخص اپنے گھر سے کسی دوسری جگہ جانا چاہتے تو اس کا ساٹھ فیصد وقت ضائع ہو گا، اس کا پانچواں حصہ بس اسٹینڈ میں انتظار میں کٹے گا اور باقی سفر طے کرنے میں ٹیوب میں سفر کرنے والے البتہ مقابلاً جلدی پہنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ بس سردس بہت اچھی ہے۔

بسوں اور کاروں والوں کو لندن میں ایک اور مشکل کا بھی سامنا ہے جس سے ہمارے ملک کے بس اور کار والے محفوظ ہیں۔ سڑکوں پر جن مقامات پر زیر اگرانگ کے نشان بنے ہوتے ہیں وہ دراصل کار اور بس ڈرائیور کے صبر کا امتحان ہیں۔ جیسے ہی کسی راہ گیر نے زیر اگرانگ پر قدم رکھا دونوں طرف سے آنے والے ٹریفک کے لیے لازمی ہے کہ وہ رُک جاتے۔ سڑک عبور کرنے والے اس معاملے میں تیز رفتاری کا مظاہرہ بھی نہیں کرتے۔ بڑے اطمینان سے ٹہلتے ہوئے سڑک عبور کرتے۔ بڑے بوڑھے تو خیر مجبور ہیں لیکن نوجوان اور صحت مند لوگ بھی بڑے اطمینان سے ٹہلتے ہوئے گزرتے ہیں۔ پھر ان کے گتے ہیں وہ بھی چل قدمی کرتے ہوتے جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر گتے اپنے اندھے مالکوں کو سڑک عبور کراتے ہیں۔ کئی بار ہم نے اکیلے گتے کو بھی سڑک پر سے بڑے اطمینان سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ ہر قسم کے ٹریفک کے لیے لازمی ہے کہ جس وقت کوئی حیوان یا انسان (گتا) زیر اگرانگ پر سے گزر رہا ہو تو رُک جائیں اور اس وقت تک روانہ نہ ہوں جب تک عبور کرنے والا سڑک کے دوسرے کنارے پر نہ پہنچ جاتے۔ یہ نہیں کہ بے صبری میں جیسے ہی وہ درمیان میں پہنچے آپ کار دوڑا دیں۔ دراصل دنیا بھر میں ٹریفک کا اصول یہ ہے کہ پیدل چلنے

والے کا حق سب سے افضل ہے (ہمارے ملک کی تو بات ہی اور ہے جہاں پیدل چلنے والے کو کاروں بسوں والے گتے ہی نہیں) اس لیے جب کوئی راہ گیر سڑک عبور کر رہا ہو اور اسے کوئی سواری ذرا سا دھکا بھی مار دے تو اس کی سزا انتہائی سنگین ہے اور مشکل کی بات یہ ہے کہ یہاں جو سزا مقرر ہے وہ ملتی بھی ضرور ہے، کوئی اس سے بچ نہیں سکتا) اور اگر کہیں راہ گیر کو زیادہ چوٹ آجائے یا وہ الٹ کو پھیرا ہو جائے (جو میں نے ایک بار بھی نہیں سنا) تو نہ صرف سواری استعمال کرنے والے کو انتہائی سنگین سزا دی جائے گی بلکہ بھاری رقم معاذضے کے طور پر بھی ادا کی جائے گی۔ یہ وہ بات ہے جو ہمارے ملک کے لوگوں کی سمجھ میں شاید نہ آتے۔ اس لیے کہ ہمارے شہروں کی سڑکوں پر رات دن درجنوں بلکہ بعض اوقات سینکڑوں لوگ کاروں۔ بسوں اور وگیزوں کی پیٹ میں آکر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بچے۔ بوڑھے۔ جوان عورتیں کون ہیں جو اس یا لاتے ناگمانی سے محروم ہیں؟ اکثر تو ہلاک کرنے والا موقع سے بھاگ ہی جاتا ہے اور اگر کوئی شامت کا مارا پکڑا بھی جاتے تو کچھ تہہ نہیں چلتا کہ اسے کیا سزا ملی ہے زیادہ سے زیادہ چھ ماہ یا ایک سال۔ اکثر تو یہ بھی نہیں۔ تو جہاں انسانی جانوں (خصوصاً پیدل چلنے والوں) کی زندگی کی اتنی کم اہمیت ہو، جتنی کیڑے مکوڑے کی بھی نہیں ہوتی وہاں انسانوں کے بنیادی حقوق کے بارے میں سوچنا اپنا دل جلانے کے سوا اور کیا ہے؟

ٹریفک کے قوانین پر یہاں جس طرح غل ہوتا ہے۔ وہ بھی قابل دیدار قابل تعریف ہے۔ اگر کوئی کار کسی دوسری کار کو خراش بھی لگا دے تو یا تو وہ زبانی منہ مانگا فیصلہ کرے یا پھر انشورنس والے بھاری رقم دلاتے ہیں۔ ابھی کل ہی رپورس کرتے ہوئے ہمارے دوست جاوید ملک نے اپنی کار کے دھتے سے ایک پارک کی بونی موٹر سائیکل گرا دی۔ نقصان کچھ بھی نہیں ہوا۔ مگر انھوں نے انشورنس اور پولیس کے ڈر سے خوشامد کر کے بمشکل بیس پونڈ دے کر جان چھڑائی۔ اپنے ایک دوست کا لطیفہ شاید ہم نے

برعکس ہے۔ جب ہم غلام تھے اس وقت کے مقابلے میں آج ہمارے اندر خامیاں، کمزوریاں اور کوتاہیاں کہیں زیادہ ہیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ غربت اور معاشی پسماندگی کا عذر بھی قابل قبول نہیں لگتا اس لیے کہ آج تیسری دُنیا کی اقوام معاشی اعتبار سے کہیں زیادہ بہتر اور مستحکم ہیں تو ان میں پہلے سے کہیں زیادہ اخلاقی اور سماجی جرائم پیدا ہو گئے ہیں۔ جوں جوں ہماری خوش حالی میں اضافہ ہو رہا ہے ہمارے لالچ اور خود غرضی میں بھی دن و دنارات چوگنا اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا یہ مفروضہ بھی اب غلط ثابت ہو چکا ہے کہ معاشی بد حالی اخلاقی خرابیوں کو جنم دیتی ہے۔ مغربی اقوام کو دیکھتے تو معلوم ہو گا کہ وہ بھی اب پہلے سے کہیں زیادہ ”بیمار“ ہیں نفاذ قانون پر نظر ڈالیے تو پتہ چلے گا کہ لاقانونیت پہلے سے زیادہ ہو چکی ہے۔ روزمرہ کے نظم و ضبط میں خاصا انتشار ہے۔ امریکی اور یورپی سوسائٹی میں جرائم اور اخلاقی کمزوریاں حد سے زیادہ بڑھ چکے ہیں۔ نیویارک میں ایک بار دو گھنٹے بجی غائب ہوئی تو وہ ادھم چاکہ ہمارے ہاں لوڈ شیڈنگ کے پورے عرصے میں ایسا نہیں ہوا ہو گا۔ انگلستان اور انگریز کسی زمانے میں کردار اور قانون کا لحاظ کرنے کے سلسلے میں ضرب المثل تھے وہاں کی پولیس کی لوگ مثالیں دیا کرتے تھے، مگر اب کیا حال ہے؟ انگلستان کی پولیس جرائم جیسے چور پستی کرتی ہے خصوصاً ایشیائی آبادی کے مسائل سے اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں خود لندن شہر میں ایشیائیوں کے گھر جلاتے گئے کئی خاندان جل کر مر گئے۔ ٹوٹ مار اور تشدد کے بے شمار واقعات رونما ہوتے مگر انگلستان کی مستند پولیس آج تک کسی ایک کا بھی کھوج نہیں لگا سکی۔ برصغیر اور انگلستان کے دوسرے علاقوں میں ایشیائی باشندوں کے گھر بار اور دکانیں جلاتے جا رہے ہیں، ٹوٹی جا رہی ہیں، جاتیادیں اور کاروبار برباد کیے جا رہے ہیں مگر پولیس خاموش تماشاخی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ قانون پسند اور انصاف کے خوگر انگریز نے ان

آپ کو نہیں سُنایا۔ انہوں نے ایک پُرانی پٹھنچر قسم کی مٹی سا تیز کار چالیس پونڈ میں خریدی (یہ چند سال پہلے کا واقعہ ہے) ایک بار گزرتے ہوئے ایک کار والے نے اس پر نشان ڈال دیا۔ انشورنس نے انہیں ۸۲ پونڈ ہرجانہ دلایا۔ چند ہفتے بعد کسی اور نے انہیں ٹکڑ مار دی۔ ٹکڑ معمولی تھی۔ مگر انہیں ۲۱۳ پونڈ معاوضہ ملا۔ پھر تو وہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کوئی آکر ان کی کار کو ٹھوکا مارے تو وہ مزید رقم وصول کریں۔ ایک سال بعد انہوں نے اپنی یہ مٹی کار ۲۴ پونڈ میں فروخت کر دی۔ ذرا حساب لگائیے کہ اس سودے میں انہوں نے کیا کمایا؟ مگر یہ سب اس لیے کہ ٹریفک کے قوانین پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ ہم نے ان سے کہا کہ شکریہ آپ انگلستان میں ہیں، پاکستان میں ہوتے تو اگر نئی کار کو بھی کوئی مار کر برباد کر دیتا تو رطانی جھگڑے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا اور اگر پولیس کچری کے چکر میں پڑتا تو مزید وقت برباد ہوتا اور پیسے جو خرچ ہوتے سوا لگ۔

تیسری دُنیا کے ملکوں کو ترقی پذیر کیے یا پسماندہ بات تو ایک ہی ہے۔ ان پسماندہ ملکوں میں ایک پسماندگی تو یہ ہے کہ یہ معاشی اور مالی طور پر مغرب کے مقابلے میں بہت زیادہ پسماندہ ہیں۔ پھر تعلیمی اور سائنسی میدان میں بھی یہ مغرب سے بہت پیچھے ہیں ٹیکنالوجی کے میدان میں ان میں اور امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں ”صدیوں“ کا فاصلہ ہے۔ یہ سب تو ہے لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ معاشرتی اور سماجی اعتبار سے بھی یہ مغرب سے بہت پیچھے رہے ہیں۔ ہماری اخلاقی خرابیوں پر جب کوئی مکتہ چینی کرتا ہے تو ہمارا آسلان جواب یہ ہوتا ہے کہ صاحب ہم لوگ عرصہ دراز تک غلام اور محکوم رہے ہیں اس لیے یہ خرابیاں ہم نے ورثے میں پائی ہیں۔ ہماری بے شمار اخلاقی، سماجی اور کاروباری خامیوں کو غربت اور معاشی پسماندگی کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ کسی حد تک یہ درست بھی ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ غلامی کے دور میں ہمارے اندر جو خرابیاں پیدا ہو گئیں تھیں آزاد ہونے کے بعد اب ان میں بندرتج کمی ہونی چاہیے تھی لیکن عملی طور پر صورت حال اس کے

ہمارے ملک میں اور دوسرے ایشیائی ملکوں میں جعلی اشیاء تیار کرنا ایک پرانی شکایت ہے اور اب ہمارے ہاں یہ معمول میں داخل ہو چکی ہے۔ خیر ہم لوگ تو اس بارے میں اتنے سنگدل اور بے حس ہو چکے ہیں کہ ادویات میں بھی ملاوٹ کرتے ہیں اور جعلی ادویات تیار کر کے فروخت کر دیتے ہیں۔ بعض جان بچانے والی ادویات بھی جعلی ہوتی ہیں۔ ہسپتالوں میں سبلائی کیے جانے والے بے شمار انجکشن محض سادہ پانی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مگر اب یہ بیماری محض ہانگ کا ٹنگ، بینیکا، بھارت اور پاکستان تک محدود نہیں رہی، یورپ کی ملکوں میں بھی عام ہو گئی ہے۔ اور تو اور انگریز بھی اس دبا کا شکار ہو چکا ہے۔ کوئی وقت تھا جب جاپانی جعلی اشیاء اور کھلونے بنانے کے لیے بدنام تھے اب جاپانی مصنوعات کی نقلیں بھی بازار میں موجود ہیں اور جاپانی صنعت کار اور حکومت شور مچا رہے ہیں کہ مصنوعات چوروں کا انسداد کیونکر ہو؟ کئے چور کو موردِ الامحارہ آپ کو یاد آیا کہ نہیں؟ ایشیا اور مشرقِ بعید کی تو بات ہی کیا خود انگلستان میں یہ دبا پھیل چکی ہے۔ ہر چیز کی نقل بازار میں دستیاب ہے۔ مصنوعات، گھڑیاں، بجلی کا سامان، ریڈیو، ٹی وی، کیسٹ ریکارڈر، ہی نہیں فیشن اور ڈیزائن بھی چوری ہو رہے ہیں اور خوب دھڑتے سے۔ خوشبویات کی چوری، کچن کے آلات کی چوری، ٹیکنیکل اشیاء کی چوری یہاں تک کہ کپڑوں کے ڈیزائن اور فیشنوں کی چوری۔ ایک اندازے کے مطابق ساری دنیا میں سالانہ ساٹھ بلین کا نقصان صنعت کاروں کو پہنچایا جا رہا ہے۔

انگلستان میں کپڑوں کے ڈیزائن اور فیشن کی صنعت بہت بڑی صنعت سمجھی جاتی ہے مگر چوری کرنے والے آئیڈیاز اور ڈیزائن اور فیشن بھی چرا رہے ہیں۔ انگلستان کی ڈیزائن کونسل فریاد کر رہی ہے کہ ”ڈیزائن بچاؤ کمیٹی“ بناتیے اور اس مقصد کے لیے نوٹراسیکیمیں نافذ کیجئے درنہ فیشن اور ڈیزائن کی صنعتیں ٹھپ ہو کر رہ جائیں گی۔ فیشن اور

تمام واقعات کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ بھی مسترد کر دیا ہے۔ محض پولیس کی تفتیش پر انحصار کیا جا رہا ہے اور پولیس پر ایشیائی باشندے کھلم کھلا الزام عائد کر رہے ہیں کہ یہ جان بوجھ کر مجرموں سے جینم پوشی کرتی ہے۔ پولیس میں دوسری کمزوریاں اور خرابیاں بھی پیدا ہو چکی ہیں اگرچہ ہماری پولیس کے مقابلے میں یہ بہت کم ہیں۔ مگر حجامِ بتدیج انحطاط اور زوال پذیری کی طرف ہے۔

بجلی کی چوری ریڈیو لائسنس اور ٹی وی لائسنس کے پیسے بچانا ہمارے ہاں تو معمول میں داخل ہے۔ چند سال پہلے تک کسی انگریز کے بارے میں ایسا سوچنا بھی محال تھا۔ مگر اب صورت حال یہ نہیں ہے۔ ٹی وی لائسنس فیس کی چوری ہی کو لے لیجئے ٹی وی لائسنس کی چوری کرنے والوں کی تعداد اس وقت انگلستان میں سولہ لاکھ کے ٹک بھگ ہے۔ یعنی ہر سال سولہ لاکھ گھروں کے باسی ٹی وی دیکھنے کے باوجود لائسنس فیس ادا نہیں کرتے۔ یہ اعداد و شمار ہوم آفس نے جاری کیے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ جس تیزی سے یہ دبا پھیل رہی ہے اس کے مطابق ۲۰۰۰ تک انگلستان میں بھی ٹی وی لائسنس فیس چوروں کی تعداد میں بیس لاکھ تک پہنچ جاتے گی۔ یہ سب اس وقت ہو رہا ہے جب کہ لائسنس فیس وصول کرنے والا محکمہ خاصا مستعد ہے۔ اب محکمہ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ جن لوگوں نے ۱۹۸۲ء تک ٹی وی لائسنس فیس ادا نہیں کی ہے ان پر بھاری جرمانے عائد کیے جائیں، کیونکہ لائسنس فیس بچانے والے سرکاری خزانے کو دس کروڑ پونڈ سالانہ کا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ بی بی سی ٹیلی ویژن کی آمدنی کا انحصار بھی لائسنس فیس ہی پر ہے۔ چنانچہ بی بی سی کو اس وقت تقریباً ساڑھے چھ کروڑ پونڈ کا نقصان ہو رہا ہے اس کا اثر بی بی سی کے اخراجات پر پڑ رہا ہے۔ پیچھے دنوں بی بی سی کے اسٹاف نے تنخواہیں اور معاوضے بڑھانے کے لیے جو ہڑتال کی تھی وہ بھی دیکھا جلتے تو اسی کا نشانہ قرار دی جاسکتی ہے۔

اور اسٹیک بار میں پہنچے تو وہ محض اُبلّا ہوا انڈا کھانا چاہتے تھے گرد و طیس کا اصرار تھا کہ ذرا ان غذاؤں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ وہ غذائیں کیا تھیں اس بارے میں جاننا مشکل تھا کیونکہ عجیب و غریب ناموں سے تو کھانوں اور غذاؤں کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا گاڑنٹ کتا ہے کہ ہم امریکیوں کی ہر چیز کی نقل کرنے کو عین سعادت سمجھتے ہیں جب کہ ان امریکیوں نے وہاٹ ہاؤس میں ایک چھوٹا سا ایسا بیٹن بھی لگا رکھا ہے جسے دباتے ہی ساری دنیا نیست و نابود ہو جاتے گی۔ امریکی انگلستان کو ایک بڑے سائز کا ڈونی لینڈ سمجھتے ہیں۔ بھلا اس سے بڑی حاکت اور کیا ہو سکتی ہے؟ امریکیوں کو دُلا ہونے کے لیے ورزش کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی مصروفیات اور وقتِ مقررہ پر کام ختم کرنے کی کوشش ہی انھیں دُلا کرنے کے لیے کافی ہے۔

اب ذرا امریکی عورتوں کے بارے میں مائیکل ہیٹھ صاحب کی رائے سنیں۔ امریکی تو خیر دنیا کے لیے خطرے کا باعث ہیں، ہی مگر ان کی عورتیں اس سے بھی بڑا خطرہ ہیں۔ عورتیں خطرہ ہی نہیں دشمن ہیں۔ میں امریکی عورتوں کا مقصد آج تک حل نہیں کر سکا۔ امریکی عورت عجیب و غریب شے ہے۔ وہ اپنے گھروں سے اور لباسوں سے باہر نکل چلی ہیں پیسے کمانے کی دوڑ میں مردوں کے شانہ بشانہ دوڑ رہی ہیں۔ بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کرنے کے لیے مردوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کو تیار ہیں عظیم ترین کارپوریشنوں کی صدر بھی ہیں اور بڑے بڑے کاروبار چلانے کی دعویدار بھی لیکن ذرا سا بھی جذباتی صدمہ پہنچتا ہے تو چیخنے چلانے اور رونے لگتی ہیں۔ سب کچھ کرنے کے باوجود گھر چ کر دیکھتے تو اندر سے عورت کی عورت۔ بھتی خوب ہیں یہ امریکی عورتیں بھی یعنی مردوں کے مقابلے کے لیے لگا ہر وقت تیار ہیں مگر خالص عورت ہونے کا حق بھی استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ سب سے زیادہ حیرانی مجھے وہ برتاؤ دیکھ کر ہوتی جو یہ عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ روا رکھتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتی ہیں ایک عورت دوسری عورت کی شکل سے بیزار ہے۔

ڈیزائن ایجاد کرنے والے لاکھوں کروڑوں پونڈ صرف کر کے نئے خیالات اور ایجادوں کو جنم دیتے ہیں۔ نقل کرنے والے ان کی ہر ہون نقل کر کے بازاروں میں پہنچا دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں لندن میں ایک نمائش گئی جس کا نام تھا ”مصنوعی اور نقلی اشیاء کی نمائش“ اس نمائش میں نقلی اور مصنوعی اشیاء پیش کی گئی تیں۔ خوشبو کی مصنوعات انگلستان اور فرانس میں کروڑوں، اربوں پونڈ کماتی ہیں۔ مگر اب چوروں نے ان کی سستی نقیبیں بازار میں پہنچا دی ہیں۔ خوشبو کی مشقوں کو جو نقصان ہو رہا ہے اس کا اندازہ کروڑوں میں ہے۔ اس کے بعد شراب کا نمبر آتا ہے۔ عمدہ شرابیں تیار کرنے والے رورسہ ہیں کہ چوروں نے ان کی ہر ہون نقل بنانی شروع کر دی ہیں۔ اکثر تو نام میں زیر زبر کا فرق پیدا کر کے استعمال کرتے والوں کو دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ کپڑوں کے ڈیزائنوں میں بھی یہی اندھیر ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں لوگ جان بچانے والی دوائیاں مصنوعی بنا کر فروخت کر دیتے ہیں مگر اب انگلستان جیسے ملک میں بھی یہ وبا پھیل چکی ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ امریکہ میں مصنوعی دل اور پیس میکر کی نقیبیں بنائی گئیں ہیں۔ اب بتائیے کہ دل کے مریض کہاں جاتیں؟ لیکن دولت کا لالچ لوگوں کو اندھا بنا رہا ہے۔

امریکہ کے ذکر پر یاد آيا کہ پچھلے دنوں ایک انگریز کارٹونسٹ امریکہ کا دورہ کر کے آیا تو بے شمار کہانیاں اپنے ساتھ لایا۔ اب ذرا اس انگریز کارٹونسٹ کے تاثرات کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے اور سر ڈھنٹے۔

مائیکل ہیٹھ نے امریکہ میں پانچ ہفتے گزارنے کے بعد جو خلاصہ نکالا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ مائیکل ہیٹھ نے لکھا ہے کہ جب وہ طیارے سے باہر نکلا تو جسے دیکھتے وہ یہی کہہ رہا تھا کہ جانیے اچھا دن گزار رہیے۔ یہ سُن سُن کر بے چارے کارٹونسٹ کے کان پک گئے کیونکہ ہر چند منٹ کے بعد اسے یہی الفاظ سننے کو مل رہے تھے۔ یوں لگا جیسے یہ الفاظ کمپیوٹر میں ڈال دیئے گئے ہیں اور لوگوں کے کانوں میں انڈیے جا رہے ہیں ریسٹورنٹ

بظاہر وہ عورت سے عورت کی ہمدردی کا راگ الاپتی ہیں جو محض بناوٹ ہے۔ یہ ترکیب دراصل مردوں کو پریشان کرنے کے لیے ہے، حالانکہ امریکی مردانہ کی عورتوں کے مقابلے میں کم پیچیدہ ہیں۔

جرائم

جرائم تو لندن میں (اور انگلستان میں) پہلے بھی ہوا کرتے تھے اور خاصے گھمیر قسم کے جرائم کیونکہ ترقی یافتہ قومیں کیونکہ سبھی کاموں میں ترقی یافتہ ہیں اس لیے جرائم کے مسئلے میں بھی یہ ترقی پذیر اقوام سے بہت آگے ہیں۔ یہاں پولیس کے پاس جدید ترین آلات ہوتے ہیں۔ تحقیق اور تفتیش کے جدید ترین طریقے انھیں آتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے یہ جرائم کا منٹوں میں پتہ لگا سکتے ہیں۔ پھر قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی کافی موثر اور مستعد ہیں۔ اس کے باوجود یہاں یہ عمارت عملی طور پر استعمال میں آتا ہے کہ مجرم قانون سے کہیں زیادہ ہوشیار اور چالاک ہیں۔ انھوں نے چوری ڈاکے اور قتل کے ایسے ایسے حیران کن اور ساٹھک طریقے اختیار کیے کہ پولیس اپنی تمام مہارت اور استعداد اور ہوشیاری کے باوجود منہ دیکھتی رہ گئی لیکن پولیس نے پھر بھی بہت نہ ہاری۔ مجرم جو طریقے استعمال کرتے ہیں پولیس ان کا کھوج لگا لیتی ہے۔ اور انھیں پکڑتی ہے لیکن مجرم پھر پولیس سے آگے نکل جاتے ہیں، چنانچہ جی اور چوہہ کا یہ کھیل نہ جانے کب سے یہاں پولیس اور مجرموں کے باہین کھیلا جا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی مجرم پولیس سے زیادہ ہوشیار نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایک دن ضرور پکڑا جاتا ہے، بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں اس لیے ہزاروں لاکھوں کی چوری اور ڈاکوؤں پر یہاں کے بڑے مجرم اپنا وقت اور دماغ ضائع نہیں کرتے، لاکھوں کروڑوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں روپے نہیں پونڈز اور

ڈالرز! اب حساب لگالیجئے کہ ہماری کرنسی میں یہ کتنی رقم ہوگی؟
خیر بڑے مجرموں کی سرگرمیاں تو ہمیشہ سے جاری ہیں لیکن پہلے یہاں چھوٹے موٹے جرائم کی رفتار نسبتاً بہت کم تھی۔ اب پچھلے چند سالوں میں لندن کے چور بھی اٹھائی گیارہ کروڑ لگے ہیں، جہاں موقع ملا گھر میں گھس کر جو سامان بھی ہاتھ لگا اڑا لیا، کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوتے اور ٹی وی، دی سی آر اور دوسرا ایسا سامان اٹھا کر چھپت ہو گئے، اگر نقدی ہاتھ لگ گئی تو وہ بھی لے گئے۔ زیور البتہ یہاں کی عورتیں نہیں استعمال کرتیں۔ (سوائے ایکٹرسوں وغیرہ کے) اس لیے چور بھی زیورات سے محروم رہتے ہیں۔ اس کی جگہ انھیں نوادرات مل جاتے ہیں۔ نوادرات کی یہ قوم بہت دلدادہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی قیمت سینکڑوں ہزاروں بلکہ بعض حالات میں لاکھوں پونڈ ہوتی ہے پھر نادر اور اصل تصاویر (پینٹنگ) یہاں کے کھاتے پیتے لوگوں کی کمزوری ہے۔ اور چوروں کی بھی، لہذا قیمتی پینٹنگز کی چوری بھی عام ہے بلکہ پچھلے چند سالوں میں تو بہت عام ہو چکی ہے مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا معاشی بحالی کے ساتھ ساتھ لوگوں کا معیار زندگی گرا تو چوروں کا معیار بھی گر گیا۔ اب چھوٹی موٹی چوریاں اور اٹھائی گیری کے واقعات پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہو گئے ہیں مثال کے طور پر!

میرے بھانجے کی نئی مرسیڈز گھر کے باہر پارک ہے۔ رات کو چور آکر پچھلا ڈبہ سکریں توڑتے ہیں اور قیمتی ریکارڈ پلیئر نکال کر لے جاتے ہیں۔ یہ حرکت چوروں نے دوسری بار کی ہے ایک بار پہلے بھی وہ ایک ریکارڈ پلیئر نکال کر لے جا چکے ہیں۔ کاروں میں قیمتی چیزیں اب محفوظ نہیں ہیں۔ آتے دن اس قسم کی چوریاں ہونے لگی ہیں۔

ایک پاکستانی کے گھر میں بارش کا پانی گھس آیا عمارت کی حالت خراب ہو گئی وہ کراتے کے فلیٹ میں چلے گئے، اور گھر میں مرمت شروع ہو گئی۔ ایک رات چور آئے اور تمام قیمتی قالین، برتن، فرج، ٹی وی اور دی سی آر لے گئے۔ اس قسم کی چوریاں

بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ۱۴۱ پورٹسٹن ۵۵ رینج روڈز، ۹۸ مرسڈیز فیزا اور ۳۰۰ سے زائد جیگوشرا اور بی ایم ڈبلیو کاریں۔

پولیس کہتی ہے کہ اگر چوروں میں قیمتی کاروں کا شوق کم نہیں ہوا تو اس سال کار چوری کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہو جائے گا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ قوم ریکارڈ قائم کرنے کی بہت زیادہ شوقین ہے۔ یہ چور ایک منٹ کے اندر نہایت اطمینان سے کار کا تالا کھول کر کار لے کر رخصت ہو جاتا ہے۔ مالک حیران ہیں کہ ان حضرات کو چوری سے روکنے کا بھی کوئی طریقہ ہونا چاہیے نہا، اس وقت ایک رولز رانس کی قیمت پچاس ہزار پونڈ ہے) چند دنوں کے اندر ساٹھ رولز رانس کاریں غائب ہو چکی ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ چوری شدہ کاریں جاتی کہاں ہیں؟ ہمارے ہاں تو قبائلی علاقے موجود ہیں مگر انگریز کیا کرتے ہیں؟ یہ کاریں پڑوسی یورپین ملکوں میں بھیجی جاتی ہیں اس سے پہلے کہ چوری کا عزم ہو چور صاحب بڑے مزے سے کاریں سوار ہو کر فرانس یا جرمنی کے لیے سرحد عبور کر لیتے ہیں۔ بہت سی کاریں جعلی کاغذات کی مدد سے ایکسپورٹ کر دی جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں لندن میں ایک جاسوس امریکہ میں بنی ہوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کو فلم میں ایک کار نظر آئی۔ اس رولز رانس کی نمبر پلیٹ لندن کی تھی اس نے چیک کیا تو پتہ چلا کہ یہ کار چوری ہو چکی تھی۔ دیکھی آپ نے چور کی دیدہ دلیری، سرانگھاں اس کار کو بڑا مد کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا اس لیے کہ فلم کے آخر میں یہ کار ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکی تھی۔ پولیس کہتی ہے کہ کار خریدنے سے پہلے پوری چھان بین کریں۔ اور اس مقصد کے لیے ایک فون نمبر بھی مخصوص کر دیا گیا ہے مگر چور آخر چور ہیں، پولیس کے بھی کان کاٹتے ہیں۔ چوروں نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ دفتر سے معلومات حاصل کر کے کسی بھی قیمتی کار کے جعلی کاغذات بنا لیتے ہیں۔ جب وہ یہ کار فروخت کرتے ہیں تو خریدار ان کاغذات پر شک نہیں کر سکتا۔ یہ نہیں کہ

اب لندن میں عام ہو گئی ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ کسی وقت گھر خالی مت چھوڑو ورنہ چور ہاتھ صاف کر جائیں گے۔ مگر گھر خالی کیسے نہ چھوڑیں کام نہ کریں تو گھر والے کھائیں کہاں سے؟

کاروں کی چوریوں سے ہم پاکستان میں پریشان ہیں مگر حوصلہ رکھیے لندن والے بھی کچھ کم پریشان نہیں ہیں۔ گزشتہ دو سال میں تو کاروں کی چوری ایک مصیبت بن گئی ہے۔ سینکڑوں کاریں ہر سال چوری ہوتی ہیں اور کاریں بھی نہایت قیمتی، رولز رانس، مرسڈیز وغیرہ اور وہ بھی جدید ترین ماڈل کی۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کا کہنا ہے کہ اس سال اب تک پانچ سو کے لگ بھگ قیمتی اور نئی کاریں چوری ہو چکی ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں لندن میں چوری ہونے والی کاروں کی تعداد چھ ہزار سے بھی بڑھ گئی ہے ہو سکتا ہے ہمارے ملک میں کاروں کی چوری اس سے زیادہ ہوتی ہو۔ لیکن لندن میں کچھ عرصے پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ لوگ اپنی کاروں سے یوں محروم ہو جائیں گے۔ لندن والوں نے بھلا کب یہ سوچا تھا، اب یہاں اس سلسلے میں کھوج لگانے کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کیا گیا ہے۔ محکمے نے فی الحال تو یہ سفارش کی ہے کہ بھاتی اپنی اپنی کاروں کی خود حفاظت کریں۔ اس کے ساتھ ہی محکمے نے کاریں بنانے والی فیکٹریوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ کار چوری کو روکنے کے لیے کاروں میں حفاظتی آلے لگائیں۔ بھلا بتاتے یہ بھلا کیا مشورہ ہوا؟ آلے تو پہلے بھی لوگ لگاتے ہیں۔ ایسے الارم بھی کاروں میں نصب ہوتے ہیں کہ کار کو ہاتھ لگاتے ہی الارم چھینے چلانے لگتا ہے مگر میں نے عرض کیا ہے نا کہ چور عاقلوں سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ وہ ان الارموں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ آرام سے کار کھولی اور اپنا کام کر گئے۔ اب سنئے! پچھلے چند دنوں میں کتنی قیمتی کاریں چوری ہوئی ہیں۔

۲۱ رولز رانس ایک کی قیمت لاکھوں پونڈ ہوتی ہے اور معمولی آدمی تو اس کے

پاکستان میں تو یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا بھی ہے۔ لیکن انگلستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا سائیکل چوری کا انسداد بھی مشکل ہے۔

چوری یوں بھی ہوتی ہے کہ ایک لارڈ کے گھر میں دو آدمی دوڑک لے کر گئے اور ملازموں کو بتایا کہ وہ قیمتی پینٹنگز کی صفائی کرنے آئے ہیں۔ ملازم انہیں کام پر لگا کر چلے گئے۔ شام کو صفائی کرنے والے واپس گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ بیش بہا اصلی پینٹنگز لے گئے ہیں اور ان کی جگہ جعلی پینٹنگز لگا گئے ہیں نقصان ... دس کروڑ پونڈ۔



پولیس بالکل بے بس ہے۔ پچھلے چند ہفتوں میں پولیس نے ۲۵ کار چور پکڑے۔ بھی ہیں جنہوں نے اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیا ہے۔ انگلستان والوں کی یہ ادا میں بہت پسند ہے کہ بد قسمتی سے اگر کوئی مجرم پکڑا جاتا ہے تو نوے فیصد مجرم اپنے جرم کا اقرار کر لیتے ہیں، شاید سچ بولنے کی عادت سے مجبور ہو کر۔ لندن کی کاریں۔ سیرونی ملکوں ہی میں نہیں انگلستان کے دوسرے علاقوں میں بھی فروخت کر دی جاتی ہیں۔ اور دوسرے ہی دن تنہا نمبر پلیٹ کے ساتھ سڑکوں پر دوڑنے لگتی ہیں۔ جسی ڈرائیونگ لائسنس اور دوسرے کاغذات تیار کرنا چوروں کے لیے باتیں ہاتھ کا کام ہے اور جعل سازی بھی ایسی کہ بالکل مکمل۔

مشکل یہ ہے کہ کار چور چوریاں کر رہے ہیں اور پولیس والے انہیں پکڑنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں مگر مصیبت کار والوں پر نازل ہوتی ہے۔ انشورنس کمپنیوں نے اپنے ریٹ بڑھا دیتے ہیں اور اب کاروں کی انشورنس پر (صرف قیمتی کاروں کی) انشورنس کمپنیاں ہر سال قریباً پانچ سو ملین پونڈ (یعنی ایک ارب روپیہ کے لگ بھگ) زائد رقم وصول کر رہی ہیں۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ لندن کے چور محض قیمتی کاریں ہی نہیں چراتے یہاں ”سائیکل چور“ بھی اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور ہر سال ہزاروں سائیکلوں چوری ہو چکی ہیں۔ یعنی لندن کے چوروں کی نظر میں محمود دایا ز ایک ہی صف میں کھڑے ہیں اس معاملے میں وہ امیر غریب کی تمیز نہیں کرتے۔ اگر امیر لوگوں کی کاریں چراتے ہیں تو غریب لوگوں کی سائیکلوں کو بھی نہیں بخشتے۔ پولیس نے سائیکل چوری روکنے کے لیے یہ بندوبست کیا کہ سائیکلوں پر ایک خاص نشان کندہ کر دیتے ہیں مگر اس کا فائدہ؟ ذرا سوچتے کیا یہ ممکن ہے کہ ایک شریف شہری سائیکل پر سوار جا رہا ہے اور پولیس اس کو روک کر اس کی سائیکل چیک کرنا شروع کر دے؟ ہمارے

پولیس اور جرائم

ایک زمانہ تھا کہ لندن کی پولیس ساری دنیا میں مثالی پولیس سمجھی جاتی تھی۔ ہتھیار نام کی کوئی چیز لندن پولیس کے پاس نہیں ہوا کرتی تھی۔ خوش اخلاقی، بہتر کارکردگی اور عوام میں مقبولیت کے اعتبار سے لندن کے ”بونی“ (پولیس کانٹیل) کو فوقیت حاصل تھی۔ شہروں میں جرائم کا نام و نشان تک نہ تھا یا نسبتاً بہت کم جرائم ہوا کرتے تھے۔ قاتلوں، ڈاکوؤں اور دوسرے مجرموں کا لندن پولیس کے نام ہی سے دم نکلتا تھا۔ ”اسکاٹ لینڈ یارڈ“ کا نام دنیا بھر میں سراغ رسانی اور جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں مثالی اور حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ دنیا بھر میں سراغ سانوں کو تربیت دینے کے لیے ”اسکاٹ لینڈ یارڈ“ کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ کسی بھی ملک میں اگر کوئی عقدہ حل نہ ہوتا تو وہاں کی حکومت اسکاٹ لینڈ یارڈ کا تعاون حاصل کیا کرتی تھی۔ خود پاکستان کی حکومت نے شہید ملت لیاقت علی خاں کے قتل کی گتھی سلجھانے کے لیے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی خدمات حاصل کی تھیں دیہ اور بات ہے کہ اس کی رپورٹ آج تک منظر عام پر نہیں آسکی، قصہ مختصر یہ کہ لندن کی پولیس قانون کے نفاذ اور جرائم کے انسداد اور تحقیقات کے سلسلے میں سارے زمانے میں مشہور تھی۔ لندن کے ”بونی“ سے لوگ دالمانہ پیار کرتے تھے۔ کرسس کے دنوں میں سب سے زیادہ تحائف لندن کے پولیس والوں ہی کے حصے میں آیا کرتے تھے۔ انگلستان کے عوام کو اپنی پولیس پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ ان سے محبت کرتے

تھے۔ ان کی قدر کرتے تھے۔ ان کی ذہانت اور ذہانت پر فخر کرتے تھے۔ لندن میں پولیس نے مجرموں سے جرائم کے اعتراف کے لیے کبھی تشدد یا ”تھرڈ ڈگری“ کے طریقوں کا سہارا نہیں لیا۔ انگلستان کے قانون کے مطابق ہر شخص کو اس وقت تک مصوم اور بے گناہ سمجھا جاتا ہے جب تک کہ اس کے مجرم اور گناہگار ہونے کا پتہ اور ناقابل تردید ثبوت پولیس کے پاس نہ ہو۔ یہ تھی شہرت لندن پولیس کی اور یہ تھا اس مشہور زمانہ حکمے کا کردار۔ مگر اب یہ بات نہیں ہے۔ جہاں انگریزوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی مکوس کی ہے وہاں لندن (انگلستان) کی پولیس کی کارکردگی اور شہرت بھی خراب ہو گئی ہے۔ جرائم کی رفتار میں اضافے کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو پولیس کی کارکردگی اور ذہانت پر بھی شبہ ہونے لگا ہے۔ اور اس کی مقبول وجوہات بھی موجود ہیں۔ بادشاہ پولیس ضرورت پڑنے پر وقتہ واردات پر پہنچ سکی۔ کئی بار جرائم کا سراغ نہ مل سکا۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والوں کو پولیس سے شکایات پیدا ہو چکی ہیں۔ انگلستان کے غیر سفید باشندے تو خاص طور پر پولیس کے رویے کے شاکی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پولیس ان کے معاملے میں نسلی تعصب اور جانبداری سے کام لیتی ہے۔ دوسری طرف انگریزوں کو بھی پولیس کے رویے اور کارکردگی سے شکایت ہے۔

خیر یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ مگر اب تو لندن پولیس نے ٹیٹا ہی ڈبودی ہے۔ عوام سے بدسلوکی اور بے گناہوں پر تشدد کی شکایات عام ہو چکی ہیں۔ پولیس والوں کی بددیانتی، بدعنوانی اور رشوت خوری کے واقعات بھی عام ہو چکے ہیں۔ اور بہت دفعہ رادار مانی پرست انگریز کھوتی ہوتی سلطنت پر ماتم کناں ہونے کے ساتھ ساتھ پولیس کے کشتہ ستم کے شاکی بھی نظر آتے ہیں۔ جس دن میں لندن پہنچا اسی روز ایک انوکھا واقعہ رونما ہوا۔ پاکستان اور ہندوستان میں تو پولیس والوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ عام لوگوں سے بدسلوکی اور اہانت آمیز سلوک کریں۔ لیکن انگلستان میں بھی ایسا ہونے لگا ہے۔ حضور

تو اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ ہم نے بمشکل انھیں قابو کیا اور ہتھکڑی لگا دی کیوں کہ وہ ہسٹریائی کیفیت میں تھیں۔ شرر مچا رہی تھیں۔ نوچ رہی تھیں اور لائیں مار رہی تھیں یہ تسلیم کہ اس پکڑ دھکڑ میں ان کا تولیہ زمین پر گر گیا۔ مگر قسم لے لیں جو ہم نے ان کا عریاں بدن دیکھا ہو۔ ہم تو بس انھیں پکڑ کر گاڑی میں بٹھانے کے قصور دار ہیں مس ٹل ڈو نے عدالت کو روتے ہوئے بتایا کہ تھانے پہنچ کر بھی انھیں کپڑے وغیرہ پہننے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور اسی طرح حوالات میں ٹھونس دیا گیا۔ جج صاحب کی ستم ظریفی دیکھتے کہ انھوں نے یہ سبب سننے کے بعد تحقیقات کا حکم دیا مگر ساتھ ہی یہ دھکی دی کہ مس ٹل ڈو کو قانون کے پاسبانوں کی توہین کرنے کے جرم میں تین ماہ قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ دوسرے دن بمشکل مس ٹل ڈو کے دیکس نے ان کی ضمانت کرائی، بھلا بتاتے۔ آپ انگلستان میں پولیس سے ایسی حرکت کی توقع کر سکتے ہیں؟

مائیکسٹر میں گزشتہ دنوں پولیس نے ایک چالیس سالہ شخص جیمز ڈیوی کو اسکاٹ لینڈ یارڈ کی مخبری پر گرفتار کیا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کو یہ شخص لندن کے ایک کے قتل کے الزام میں تفتیش کے لیے درکار تھا۔ دوسرے دن جیمز ڈیوی کی لاش پولیس اسٹیشن سے مرہ خانہ پہنچائی گئی۔ لوگوں نے چلا نا شروع کر دیا کہ جیمز کو پولیس نے قتل کر دیا ہے۔ پولیس کا بیان ہے کہ انھوں نے جیمز ڈیوی کو گرفتار کر کے تھانے پہنچایا تو ڈیوی نے پولیس والوں کے ساتھ ہاتھ پائی شروع کر دی۔ ڈیوی کے بارے میں پولیس نے بتایا کہ یہ شخص ذہنی طور پر متوازن نہیں تھا۔ اور اس سے پہلے بھی مختلف جرائم میں تقریباً بیس سال جیل میں گزار چکا تھا۔ تھانے پہنچ کر ڈیوی کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ اس نے اپنے اور پولیس والوں کے کپڑے پھاڑ دیئے۔ ٹھوکرین مار مار کر اپنے جوتے کی اڑیاں توڑ دیں۔ پولیس والوں کو ناخوں سے نوجا اور دھکیاں دینے لگا کہ اگر کوئی اس کے نزدیک آیا تو وہ اس کو قتل کر دے گا۔ پولیس والوں نے اسے قابو میں کرنے کے لیے بہت کوشش

کیجیگ ہے کلجگ۔ ہمارے لندن میں ہوتے ہوئے پولیس والوں نے ایک سیلے پتھر کے گھر میں گھس کر اس کے ساتھ بدسلوکی کی۔ اسے برہنہ زیربستی کپڑ کر لے گئے اور ہتھکڑی لگا کر برہنگی کے عالم میں ہی سڑک پر گھسیٹے ہوئے پولیس کی گاڑی تک لے گئے۔ یہ ظلم و ستم مس ٹل ڈو کے ساتھ روا رکھا گیا۔ جو سیلے اسکول میں رقص کی تربیت دیتی ہیں۔ ان کی عمر ۲۹ سال ہے۔ خوب رو ہیں اور اس پاس کے محلے داروں میں ان کی عزت بھی ہے۔ مگر اب ان کی ساری عزت خاک میں مل چکی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ اپنے گھر میں غسل کر رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے جلدی جلدی تولیہ جسم پر لیٹا اور دروازہ کھولنے گئیں۔ دروازے پر دو پولیس والے موجود تھے۔ جنھوں نے بتایا کہ محلے داروں نے شکایت کی ہے کہ مس ٹل ڈو کے گھر سے شراب کی خالی بوتلیں پڑوسیوں کے گھروں میں پھینکی گئی ہیں۔ مس ٹل ڈو نے اس الزام کی تردید کی اور پولیس افسر سے کہا کہ وہ باہر چلے جاتیں تاکہ وہ لباس پہن لیں۔ مگر پولیس والوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ جب کہ پولیس نے عدالت کو بتایا کہ مس ٹل ڈو نے پولیس کے سپاہی کو ہتھ پٹر سید کر دیا۔ جس کے نتیجے میں انھیں بتایا گیا کہ وہ زیر حراست ہیں۔ پولیس والوں نے انھیں بازوؤں سے پکڑ کر خوب زور زور سے جھنجھوڑا جس کی وجہ سے ان کا تولیہ جسم سے گر گیا اور وہ ننگی ہو گئیں۔ پولیس والوں کا دل پھر بھی نہ بیجا۔ انھوں نے مس ٹل ڈو کو ہتھکڑی لگانے کی کوشش کی تو بقول ان کے، میں نے بھی جدوجہد کی ”لائیں چلا تیں اور ایک سپاہی کے کاٹ لیا“ مگر کہاں پولیس کے ہٹے کٹے سپاہی اور کہاں بیجاری نرم و نازک مس ٹل ڈو، جلد ہی پولیس والوں نے بے قابو کر کے ان کو ہتھکڑی لگا دی اور برہنگی کی حالت میں انھیں گھسیٹ کر پولیس کی گاڑی تک لے گئے۔

پولیس والوں نے جج کو بتایا کہ حضور، ہم پڑوسیوں کی شکایت پر ان کے گھر پہنچے تو انھوں نے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ ایک سپاہی کے منہ پر پٹا بچھ مار دیا۔ اس نے ہاتھ پکڑا

کی۔ ایک سپاہی نے اسے پکڑ کر قابو میں کرنے کے لیے اس کی گردن کے گرد اپنا بازو پھیلایا۔ پولیس والے نے بالکل زور نہیں لگایا مگر ڈیوی کا گلا اتنی زور سے دبا کہ اس کا سانس رُک گیا اور وہ زمین پر گر گیا۔ اس کی جان بچانے کی بہت کوشش کی گئی مگر بے سود۔ اس کے رشتہ داروں کا کہنا ہے کہ پولیس نے ڈیوی کو گلا دبا کر مار دیا۔ جبکہ پولیس کی صفاتی آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ پبلک میں اس واقعہ پر بہت لے دے ہوتی اور اب یہ مسئلہ ہوم سیکرٹری کے زیر غور ہے۔ جہاں آف کامن میں وضاحت پیش کریں گے۔ گویا ہماری پولیس اور انگلستان کی پولیس میں اب اتنا فرق ضرور رہ گیا ہے کہ وہاں کی پولیس والوں کی طرف سے ہاؤس آف کامن میں وضاحت پیش کی جاتی ہے اور اگر قصور وار قرار پائیں تو انہیں سزا بھی دی جاتی ہے۔ جبکہ یہاں ...؟ انگلستان کی پولیس ساری دنیا میں اس لیے مشہور تھی کہ یہ لوگ بالکل نہتے ہوا کرتے تھے ایک چھوٹی سی چھڑی کے سوا ان کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجرم بھی ان پر ہاتھ اٹھاتے ہوتے ہچکچاتے تھے۔ اور اگر کسی نہتے پولیس والے کو گولی کا نشانہ بنایا جاتا تھا تو ساری پبلک اس مظلوم کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ مگر بعد میں حالات بدل گئے اور لندن پولیس کو بھی ہتھیار رکھنے کی اجازت مل گئی۔ کچھ عرصہ گزر گیا تو پتہ چلا کہ لندن پولیس کو ہتھیار رکھنا کس نہیں آیا۔ پے در پے کئی ایسے واقعات رونما ہوتے کہ پولیس کی گولیوں سے لوگ ہلاک ہو گئے۔ جب ایسے واقعات زیادہ ہونے لگے تو اعلیٰ حکام نے اپنے پہلے فیصلے پر غور کیا اور نظر ثانی بھی کی۔ اب اسکاٹ لینڈ یا ریڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ لندن کے پولیس والوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ کیونکہ حال ہی میں ایک شخص اسٹیفن والدورف پولیس کی گولی سے ہلاک ہو گیا۔ اب سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے کم کوئی پولیس والا ہتھیار رکھنے کا مجاز نہ ہوگا۔ اور یہ فیصلہ بھی کوئی اعلیٰ افسر ہی کرے گا کہ کس پولیس والے

کو ہتھیار رکھنے کی اجازت دی جائے۔ ہوا یہ کہ وڈ پولیس والے ایک مجرم کی تلاش میں نکلے تو ان کا واسطہ اسٹیفن سے پڑ گیا ہے اور نتیجے میں وہ پولیس کی گولیوں سے زخمی ہو کر ہلاک ہو گیا۔ ہمارا ملک ہوتا تو پولیس والے اس کیس کو پولیس مقابلے کے کھاتے میں ڈال دیتے۔ مگر انگلستان پھر انگلستان ہے۔ ابھی یہ ملک اتنا گنہگار نہیں ہوا کہ اپنی تمام روایات کو یکدم اور یکسر بالائے طاق رکھ دے۔ معاملے کی تحقیقات ہوتی اور اعلیٰ حکام اس نتیجے پر پہنچے کہ پولیس نے بلا ضرورت فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں اسٹیفن ہلاک ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی پولیس فائرنگ کے چند واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ان واقعات کی روشنی میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ پولیس کے سپاہیوں اور بجلی سٹک کے افراد کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہ دی جائے تاکہ بلا ضرورت ہتھیار استعمال نہ کریں۔ گویا رفتہ رفتہ لندن پولیس دوبارہ اپنی پرانی روایات کو اپنا رہی ہے۔ انگریزوں کی یہ خوبی سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ قوم روایت پرست ہے اور کتنی ہی بے انصافی کیوں نہ کرے پھر بھی "انصاف پسندی" کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں صرف انگلستان ہی ایسا ملک ہے جہاں پولیس کے ہتھیاروں کے استعمال کرنے پر پابندیاں ہیں۔ اور پولیس کے ہاتھوں ہلاک والوں کی تعداد دوسرے ملکوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

دالے سڑکوں کے کنارے پرکاری روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس بھاگ دوڑ کے نتیجے میں کتنے بے گناہ لوگ حادثوں کا شکار ہوں گے۔

پولیس دالے آخر کس قسم کے مجرموں کا تعاقب کرتے ہیں؟ انگلستان میں یہ تعاقب ان کاروں کا ہوتا ہے جن کے بارے میں پولیس کو شبہ ہو جاتے کہ یہ چڑاتی گتی ہیں۔ جب کوئی کار ڈرائیور پولیس کے اشارے پر رکنے کی بجائے اور زیادہ تیز رفتاری سے بھاگنے کا ارادہ کرے تو پولیس سمجھ جاتی ہے کہ یہ کار چوری کی ہے یا پھر کار ڈرائیور شراب کے نشے میں مدہوش ہے یا پھر اسی قسم کی غیر قانونی یا غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب ہوا ہے۔ پس پھر کیا ہے۔ سمجھ لیجئے کہ پولیس اور کار ڈرائیور کے مابین اندھا دھندلیں کا مقابلہ شروع ہو جاتی ہیں اور اس بھاگ دوڑ کا انجام بسا اوقات حادثوں کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ پولیس کی کار مجرم کی کار سے ٹکرا جاتی ہے یا پولیس یا مجرم کی کار کسی اور کار یا دکان وغیرہ سے ٹکرا جاتی ہے۔ معجزاتی طور پر پولیس والے عام طور پر ان حادثات میں ہلاک یا زخمی ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ ان کی مہارت ہوتی ہو۔ اب ذرا تصور میں یہ منظر لائیے کہ آپ بڑے آرام سے اپنی کار میں چلے جا رہے ہیں کہ اچانک ایک کار اندھا دھند دوڑتی ہوئی آپ کی کار سے آگے نکل جاتی ہے۔ وہ ٹریفک لائٹس کی پروا کرتی ہے اور نہ دوسرے قوانین کی۔ ابھی آپ سنبھلنے بھی نہیں پاتے کہ سائرن کی آواز کے ساتھ ہی پولیس کی ایک کار یا متعدد کاریں نمودار ہوتی ہیں اور وہ بھی دیوانہ وار کسی ٹریفک ضابطے کا خیال کیے بغیر انتہائی تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ اس ”تعاقب“ کے خلاف انگلستان میں اب راتے عام کو بیدار کیا جا رہا ہے اور شہریوں کا کہنا ہے کہ کار چوری جیسے معمولی جرم کے شبہ میں راستوں پر سینکڑوں معصوم شہریوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دیا کماں

چور اور سپاہی

مغربی فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں آپ نے پولیس والوں کو مجرموں کے تعاقب میں اندھا دھند کاریں دوڑاتے اور آپس میں کاریں ٹکراتے ہوتے دیکھا ہو گا۔ یہ محض فلمی منظر نہیں ہے۔ مغربی فلموں کے دوسرے مناظر کی طرح یہ بھی درحقیقت وہاں کی روزمرہ زندگی کا ایک عکس ہی ہوتا ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں تو پولیس کی کاریں مجرموں کے پیچھے نہ صرف برق رفتاری سے دوڑتی ہیں بلکہ پولیس والے بے دریغ فائرنگ بھی کرتے ہیں۔ اور مجرم ان پر جوابی فائرنگ کرتے ہیں۔ اس کار رینگ اور فائرنگ کے نتیجے میں بہت سے پولیس والے، مجرم اور بے گناہ شہری ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن انگلستان میں معاملہ قدرے مختلف ہے۔ یہاں پولیس والوں کو عموماً اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں اس لیے فائرنگ کے مناظر دیکھنے میں نہیں آتے۔ لیکن کاروں کے تعاقب کا منظر انگلستان میں بھی اکثر دیکھا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے گناہ شہری، مجرم اور پولیس والے ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً صرف لندن میں گزشتہ چند سالوں کے اندر تیس سے زیادہ افراد ”چور اور سپاہی“ کی اس بھاگ دوڑ میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ بے شمار زخمی ہونے والے ان کے علاوہ ہیں۔ جس وقت عام شہر پولیس کی کاروں کو کسی دوسری کار کے تعاقب میں نہایت تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اپنی جان بچانے کی فکر کرتے ہیں۔ راہ گیر تتر بتر ہو جاتے ہیں۔ کاروں

کے مطابق کوئی بھی ایمر جنسی یا جرم اتنا سنگین نہیں ہے کہ لوگوں کی طرف سے پولیس کے خلاف کوئی مقدمہ قائم نہیں کیا گیا ہو۔ مگر مستقبل قریب میں "پولیس کارپوریشن" کے خلاف ثابت اور ٹھوس کارروائیوں کی توقع کی جا رہی ہے۔

پولیس کی تحقیقات اور تفتیش کے سلسلے میں یہ تو آپ نے سنا ہو گا کہ پولیس والے ہمیشہ بدل کر مجرموں کا سراغ لگاتے ہیں۔ لیکن لندن کے سراغداروں نے غیر قانونی قمار بازی کا سراغ لگانے کے سلسلے میں جو طریقہ اختیار کیا اس کے نتیجے میں ان پر بہت بے رحمی ہو رہی ہے۔ ہوا یہ کہ چار سراغداروں کے سپرد یہ فرض کیا گیا کہ وہ ایک شراب خانے میں واقع قمار خانہ کا پتہ لگائیں۔ یہ چاروں حضرات شراب خانے میں پہنچے اور مسلسل چار دن تک وہاں جاتے رہے۔ یہی نہیں کہ انھوں نے وہاں شراب نوشی کی بلکہ جواب بھی کھینچا اور سرکاری خزانے سے ایک سو چالیس پونڈ کی رقم جوتے میں ہار گئے۔ پولیس کے چیف سپرنٹنڈنٹ کا کہنا ہے کہ شراب اور جوتے پر جو رقم صرف ہوتی وہ حق بجانب ہے لیکن مجسٹریٹ کا خیال کچھ اور ہے۔ ایک مجسٹریٹ مسٹر مارک رومر نے یہ فیصلہ دیا کہ یہ غیر مناسب طریقہ تفتیش ہے۔ لیکن پولیس سراغ رساں سرکاری ڈیوٹی پر تھے اس لیے انھیں پچاس پونڈ رقم کی رعایت ملنی چاہیے کیونکہ انھوں نے اپنے اعلیٰ حاکم کی نگرانی میں یہ کارروائی کی تھی جسے خلاف قانون نہیں کہا جاسکتا۔ اس سراغ رسانی کے نتیجے میں پولیس دو قمار بازوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب بھی ہو گئی۔ مگر عام تاثر یہ ہے کہ پولیس والے بہت ناماڑی قمار باز ہیں۔ ایک صحافی نے مشورہ دیا ہے کہ اگر پولیس والوں کو جو اکھیل کر ہی جوار یوں کو پکڑنا ہے تو پولیس کے حکمے کو چاہیے کہ پیسے انھیں ڈھنگ سے جو اکھیلنے کی تربیت تو دے۔ گویا لندن پولیس کو اب قمار بازی کی کلاسیں بھی شروع کرنی ہوں گی۔

ایک طرف تو پولیس کارچوروں اور قمار بازوں کا قلع قمع کرنے کے سلسلے میں اتنی مستعد

کی عقل مندی ہے؟ پولیس جن افراد کی کاروں کا تعاقب کرتی ہے اور وہ حادثے کی صورت میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اب ان کے عزیزوں اور رشتے داروں نے بھی احتجاجی مہم شروع کر دی ہے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ جب وہ کسی کار کو مشتبہ سمجھنے کی صورت میں روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ اپنی رفتار اور زیادہ تیز کر کے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ محض کار چوڑھی نہیں ہے اور بہت سے سنگین جرائم میں بھی ملوث ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس ایسے لوگوں کے تعاقب میں خود اپنی جان کی بھی بازی لگا دیتی ہے۔ پولیس فیڈریشن کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ جس وقت کاروں کی بھاگ دوڑ کا یہ ڈرامہ شروع ہوتا ہے اکثر پولیس والوں کو بھی یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ جس کا تعاقب کر رہے ہیں وہ کوئی مجرم ہے؟ اسلگ کر ہے؟ پیشہ ور کار چور ہے؟ یا مدہوش ڈرائیور ہے؟ کیا پتہ کہ وہ کوئی قتل کر کے بھاگا ہو یا دھمکی یا اغوا اور آبروریزی کے جرم کا مرتکب ہوا ہو؟ پولیس فیڈریشن کا کہنا ہے کہ پولیس والوں کو اس بات کا الزام دینا افسوسناک ہے کیونکہ جس وقت کوئی ڈرائیور قانون شکنی کر کے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو پولیس والوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اسے نظر انداز کر دیں۔

نبویارک اور جرمنی میں جس وقت پولیس کاریں کسی کار کے تعاقب میں روانہ ہوتی ہیں تو پولیس ہیڈ کوارٹر سے ہر وقت رابطہ قائم رکھا جاتا ہے اور اگر معاملہ خطرناک ہو جائے تو ہیڈ کوارٹر کی طرف سے تعاقب ختم کرنے کی ہدایت کر دی جاتی ہے۔ لیکن لندن میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہاں بھی پولیس والوں کے لیے اس سلسلے میں ضروری ہدایات موجود ہیں لیکن پولیس حکام کا کہنا ہے کہ تیز رفتاری سے تعاقب کرنے والے پولیس افسر ڈر قانون سے بالاتر نہیں ہوتے اور ان کے خلاف بھی ٹریفک قانون توڑنے یا پبلک کی جان کو خطرے میں ڈالنے کے الزام میں مقدمات قائم کیے جاسکتے ہیں۔ محکمہ داخلہ کی ہدایات

ہی کار چلاتی رہیں اور آٹھ میل تک چلی گئیں۔ پیٹے کے شور سے محفوظ رہنے کی خاطر انہوں نے کار کا ریڈیو بہت بلند آواز میں کھول دیا یہاں تک کہ وہ پولیس والوں کے سائرن کی آوازیں بھی نہیں سن سکیں۔ جس وقت پولیس نے انہیں روکا وہ ۵۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے تین پیڑوں کی کار دوڑا رہی تھیں۔ کئی دوسرے کار والے ان سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی کاریں فٹ پاتھ پر چڑھانے پر مجبور ہو گئے۔ بہت سے توانے خوفزدہ ہوتے کہ کاروں کو سڑک پر ہی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پولیس نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو وہ ایک دن وے سڑک پر مخالف سمت سے داخل ہو گئیں اور انہوں نے کئی چھابڑی والوں کی دکانیں الٹ دیں۔ ان کا پیچہ شدہ ٹائر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر چکا تھا اور کار کے سامنے کا بپہر بھی غائب ہو گیا تھا۔ سامنے کے ڈکارتھ کے ٹکڑے اڑ چکے تھے مگر وہ بے فکری سے ریڈیو پر نغمے سنتی ہوتی کار اڑاتے لیے جا رہی تھیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان محترمہ نے محض دو سال پہلے ہی ڈرائیونگ لائسنس حاصل کیا ہے۔ مجسٹریٹ نے ان پر سو اتین سو پونڈ جرمانہ کیا تو وہ بہت ناراض ہوئیں اور بولیں "کیسا زمانہ آگیا ہے، بزدلوں کا تو کوئی لحاظ نہیں کرتا۔"



ہے۔ دوسری طرف عام ناثر یہ ہے کہ لندن جیسے مرکزی شہر میں جرائم کی رفتار میں اضافہ ہو گیا ہے۔ خاص طور پر تشدد کی وارداتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ امریکہ کے بعض شہروں میں تو دن ڈھلنے کے بعد لوگوں کا سڑکوں پر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ انگلستان میں پہلے یہ صورت حال نہیں تھی۔ لیکن اب ایک جاترے میں بتایا گیا ہے کہ لندن کی سڑکیں بھی شہروں، خصوصاً معمر لوگوں کے لیے غیر محفوظ ہو گئی ہیں۔ مثلاً تین میں سے دو بڑی عمر کے لوگ اندھیرا پھیلنے کے بعد سڑکوں پر تنہا نکلتے ہوتے ڈرتے ہیں۔ اس کا سبب بڑھتی ہوئی بے روزگاری، خندہ گردی کا رجحان اور منشیات کو قرار دیا گیا ہے۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ ان کی حفاظت کے لیے پولیس کو گشتی سپاہیوں اور پولیس کاروں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہیے۔

دوسری طرف پولیس کا کہنا ہے کہ صاحب بڑی عمر کے لوگوں کا تحفظ بجا لیکن کچھ عرصے سے یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ بڑی عمر کے لوگ قانون کی زیادہ پاسداری نہیں کرتے حالانکہ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ نوجوانوں کے مقابلے میں وہ قانون شکنی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ لیکن اب بڑی عمر کے لوگ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزیوں میں سب سے پیش پیش ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ خواتین کا ریڈیو بہت محتاط خیال کی جاتی تھیں مگر اب اسی لنگا بہہ رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اب قوانین کی زیادہ تر خلاف ورزی خواتین ہی کرتی ہیں۔ پچھلے دنوں ایک ۷۹ سالہ خاتون ڈرائیور کا مقدمہ ایک مقامی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان خاتون نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کے تقریباً تمام اصول کیے بعد دیگرے توڑے ہیں۔ ایک بار انہیں ایک بڑی سڑک پر ایک طرفہ ٹریفک سے قانون کی خلاف ورزی پر ٹکٹ دیا گیا۔ اس کے بعد تیز رفتاری میں ان کے چالان کیے گئے۔ چند روز بعد ایک معروف سڑک پر ان کی کار پیچہ ہو گئی مگر وہ تین پیڑوں پر

عروں کے ٹھاٹ

ہے، چنانچہ ان کے والد نے انھیں ۲۰۰ فٹ لمبی پُر تیش یاٹ خرید کر دی ہے لیکن نبیلہ اس سے مطمئن نہیں ہے، اب انھوں نے چار سو فٹ طویل یاٹ بھی خریدی ہے جس پر سیلی کا پٹرز بھی موجود رہتے ہیں۔ طلاقی نفرتی ظروف، بیش قیمت فرنیچر اور نادرتصا دیر سے آراستہ اس یاٹ کے غسل خانے سنگ مرمر کے ہیں جن میں قیمتی موتیوں کی سجاؤں ہے، اس یاٹ کی حفاظت کے لیے میزائل شکن توپیں بھی نصب ہیں، گو یا قسمت اس ۲۳ سالہ دوشیزہ پر پوری طرح مہربان ہے۔

عیش و آرام اپنی جگہ سہی نبیلہ کا کہنا ہے کہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تجارت ہے باپ نے انھیں کمپنیوں کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا رکن بھی بنا رکھا ہے۔ ان کا ایک محل فرانس کے ساحل پر بھی ہے جہاں خود ان کے بقول وہ محض لباس تبدیل کرنے کے لیے جاتی ہیں، جہاز رانی نبیلہ کا دوسرا دلچسپ مشغلہ ہے۔ بحری بیڑے میں ۲۹۶ ٹیلی فون لگے ہوتے ہیں جن میں ہیرے جڑے ہیں، نبیلہ کی عمر جس وقت پندرہ سال تھی اس وقت اس نے اپنے والد سے فرانس کر کے بیس ملین پونڈ کا ہیرا خریدا تھا مگر نبیلہ کا کہنا ہے کہ اسے ہیروں سے کوئی خاصی دلچسپی نہیں ہے، دلچسپی نہ ہونے پر یہ عالم ہے اگر انھیں دلچسپی ہوتی تو کیا ہوتا؟

خود عدنان خیشگی کی مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ وہ چوبیس گھنٹے سفر میں رہتے ہیں دنیا بھر کی خاک چھانتے ہیں مگر اپنی بیٹی سے ٹیلی فون کے ذریعہ رابطہ قائم رکھتے ہیں، بقول نبیلہ کے ان کے والدین ہی نبیلہ کے بہترین دوست ہیں۔ اب نبیلہ کو کاروں کی ریس کا بھی شوق ہو گیا ہے اور وہ آئندہ سال فرانس کی مشہور کار ریس میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ایک بار نبیلہ کو خدمتِ خلق کا شوق چڑھایا تو انھوں نے کلکتہ میں ٹرسٹریا کے کیمپ میں جا کر رہنے کا ارادہ کیا مگر بعد میں بدل دیا۔ فی الحال انھیں اپنی شادی کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں ہے مگر ان کے والد کی شادی

لندن ٹائمز کے سنڈے میگزین کے سرورق پر ایک دوشیزہ کی رنگین تصویر شائع ہوئی ہے۔ میک آپ سے چہرہ مزین، لباس ایسا کہ جسم کا بیشتر حصہ نمایاں، لگے میں قیمتی موتیوں کی مالا، ہونٹوں پر دل نواز سکراہٹ اور ہاتھ میں ایک جام۔ ایک تو صاحبِ تصویر حسین اس پر لندن ٹائمز کی رنگین طباعت، ہر دیکھتے والے کی توجہ اپنی طرف کھینچنے والی یہ جام بدست ماڈرن دوشیزہ کون ہیں؟ کوئی فلم یا ٹی وی کی اداکارہ، فیشن ماڈل، مغرب کی کوئی جدید ترین خاتون؟ جی نہیں خوش قسمتی یا بد قسمتی سے یہ ایک مسلمان عرب کی صاحبزادی ہیں اور عرب بھی کوئی گننام اور ایسا ویسا نہیں۔ دُنیا سے عرب کی مشہور شخصیات اخباری کالموں کی مستقل زینت، کاروباری حلقوں کی ایک ممتاز ہستی، نام ان کا عدنان خیشگی ہے، ایک سرکردہ عرب تاجر اور ٹھیکے دار ہیں، کہتے ہیں کہ عدنان خیشگی اس وقت دُنیا کا امیر ترین انسان ہے۔ ان کی اوسط آمدنی پانچ سو پونڈ فی منٹ ہے، ہفتوں مہینوں اور سالوں کی آمدنی کا حساب خود ہی لگائیں۔ ٹائمز کے سرورق پر شائع ہونے والی ان ہی عدنان خیشگی کی صاحبزادی نبیلہ کی ہے۔

ظاہر ہے کہ نبیلہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہیں۔ ارب پتی تاجر کی لاڈلی بیٹی ہیں، شوق بھی امیروں والے ہیں۔ دُنیا بھر میں ان کی رہائش گاہیں بکھری ہوئی ہیں، ایک اشارے پر دُنیا جہاں کی آسائشیں ان کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں، انھیں کشتی رانی کا بھی شوق

بھی گوارا نہیں کی، وزارت خارجہ نے بہت ناک بھوں چڑھائی اور ہمدی التجار متعلق ہر کر واپس چلے گئے، اب دوبئی کے حکمران شیخ رشید کا اصرار پرودہ دوبارہ انگلینڈ میں سفارت کا عہدہ سنبھالنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ تمام گزشتہ تلخ تجربات کے باوجود برطانوی وزارت خارجہ نے ان کی سفارت کی منظوری دے دی ہے۔ لیکن وزارت خارجہ نے یہ شرائط عائد کر دی ہے کہ وہ سیفر کے طور پر اپنے ذاتی کاروبار کو فروغ نہیں دیں گے اور سفارتی آداب کی پابندی کریں گے، ہمدی التجار کا کاروبار ساری دنیا کے علاوہ انگلستان میں بھی پھیلا ہوا ہے، لندن کا مشہور زمانہ سٹور ”ہیرڈز“ ان کے بھائی کی ملکیت ہے ان کی سفارت کے زمانے میں ان کے خلاف مختلف عدالتوں میں اختلافات کے سلسلے میں کروڑوں پونڈ کے مقدمات درج کرائے گئے تھے مگر انھیں سفارتی مراعات کا سہارا حاصل تھا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں وہی معاملہ ہمدی صاحب کے ساتھ بھی ہے۔ ہمدی صاحب اگرچہ برطانیہ میں متحدہ عمارات کے سیفر ہیں مگر ان کا زیادہ وقت دوبئی میں گزرتا ہے، اس کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ فلسطینیوں کا ایک گروپ ان کے خون کا پیاسا ہے اور انھیں ہمیشہ اپنی جان کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ شام کی حکومت اس لیے ناراض ہے کہ وہ ان کے حامی فلسطینیوں کو زیادہ مالی امداد نہیں دیتے عراقی ان سے اس لیے ناراض ہیں کہ ان کی ہمدردیاں عراق کے مقابلے میں ایران کے ساتھ وابستہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہمدی التجار نے موجودہ ایرانی حکومت کے لیے بہت سے سودے کرائے ہیں یہی وجہ ہے کہ سابق شاہ ایران کے پیش قیمت خزانے بھی انھوں نے خرید لیے اور لندن منگوا لیے۔ ۱۹۶۸ء کے بعد انھوں نے انگلستان میں کئی محلات اور مشہور قلعے خریدے۔ انگلستان میں ان کے عائیشان محلات کی تعداد دس بارہ ہے۔ جن کی مالیت اربوں پونڈ بتائی جاتی ہے۔ انھوں نے مختلف

ذات خود دنیا بھر کے اخباروں کی صفحہ اول کی خبر ہوتی ہے۔ بنیلہ کی والدہ ثریا خٹنگی کے بارے میں کون نہیں جانتا، انھوں نے طلاق کے بعد عدنان خٹنگی سے ایک ہزار ملین پونڈ اخراجات وصول کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

بنیلہ لبنان میں پیدا ہوتی تھیں اگرچہ ان کا وطن سعودی عرب ہے مگر ان کی پرورش لبنان اور پھر یورپ میں انگریز گورنمنٹ کی نگرانی میں ہوئی۔ تعلیم انھوں نے انگلستان میں حاصل کی۔ بقول ان کے ان کے والد خود مغرب زدہ ہیں اس لیے وہ خود بھی اسی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں۔ کمسن اور نیا سال وہ ہمیشہ اپنی والدہ کے ساتھ مناتی ہیں جو اب ان کے والد سے طلاق حاصل کر چکی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میرے باپ نے (جنھیں وہ بابا کہتی ہیں) مجھے یہ سکھایا ہے کہ مسلمان ہونا دنیا کی اہم ترین چیز ہے مگر بنیلہ سعودی ٹک ہونے کے باوجود کبھی سعودی عرب میں نہیں رہیں ظاہر ہے ان کا گزارہ مغرب ہی میں ہو سکتا ہے۔

بنیلہ عدنان خٹنگی واحد عرب نہیں ہیں جن پر دولت اور قسمت کی دیوی مہربان ہے ایسے عربوں کی تعداد اب ہزاروں لاکھوں سے تجاوز کر چکی ہے جو خدا کے فضل سے دولت میں کھیل رہے ہیں ان کی دولت مندی، خوشحالی اور فضول خرچی کی داستانوں نے اب ابتدائی عہد کے امریکی ارب پتیوں کی جگہ لے لی ہے۔ اسی قسم کے ایک خوش نصیب تاجر ہمدی التجار بھی ہیں، موصوف کا تعلق متحدہ عرب امارات سے ہے۔ ارب پتیوں اور کرب پتیوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ انگلستان میں اپنے ملک کے سیفر بھی رہ چکے ہیں مگر ان کا زیادہ وقت انگلستان سے باہر گزرتا ہے۔ یہ وہی صاحب ہیں جن سے برطانوی حکمہ خارجہ عاجز تھا، وزیر تو وزیر انھوں نے ایک بار انگلستان کی ملکہ کو بھی انتظار کرا دیا تھا، ملکہ کے کئی دعوت ناموں کی رسید دینا بھی وہ گوارا نہیں کرتے تھے، جب انھوں نے سفارت سے استعفیٰ دیا تو رسمی طور پر بیگم پلس جاکر ملکہ سے ملاقات کرنے کی زحمت بھی

صاحب جو پچھلے دس سال سے انگلستان میں مقیم ہیں مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ عام تصور کے مطابق یہودیوں کے عالمگیر اثر و رسوخ کا سبب ان کی دولت مندی ہے لیکن عرب دولت کی لہریں پیل کے باوجود اب تک دُنیا بھر کے کلیدی مقامات سے یہودیوں کو بے دخل کیوں نہیں کر سکے؟

میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ شاید یہودی دولت کے ساتھ ساتھ عقل اور منصوبہ بندی سے بھی کام لیتے ہیں !!



کاروباروں میں اربوں پونڈ کماتے لیکن سفارتی مراعات کا سہارا لے کر انگلستان میں ٹیکس ادا نہیں کیا۔ اب برطانوی حکومت چاہتی ہے کہ ان اقدامات کا اعادہ نہ ہو لیکن کیا وہ مہدی التجار اور دوہتی کے سلطان کے دباؤ کے سامنے جی رہ سکتی ہے؟

یورپ اور انگلستان میں عربوں کی پھیلتی ہوئی دولت کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں اور تو اور ایسے گناہم عرب امیر بھی ہیں جنہوں نے انگلستان کے قدیم اور نجیب الطرفین لارڈز سے ان کی جاگیروں کے ساتھ ساتھ ان کی خطابات بھی خرید لیے ہیں اور اب وہ اپنے علاقے کے لارڈ ہیں۔ یوں بھی انگلستان میں جگہ جگہ انگریزی کے ساتھ عربی زبان کا استعمال اس بات کی علامت ہے کہ یہ کاروباری قوم عربوں کو اب کتنی اہمیت دیتی ہے، ہر بازار میں عربوں کا عربی زبان میں خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ یہاں وہاں حلال گوشت اور کھانوں کی دکانیں بھی موجود ہیں۔ بے شمار سٹورڈن اور دوکانوں کی رونق عرب خریداروں کے دم قدم سے ہے جو انکھیں بند کر کے قیمت دریافت کیے بغیر برجز خریدنے کے عادی ہیں ان سے اچھے گاہک انگریز تاجروں کو بھلا اور کون ملیں گے؟

ہمارے لندن کے قیام کے زمانے میں ہی یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ اردن کے شاہ حسین نے انگلستان میں ایک ایسا محل خریدا ہے جو شاہی محل بکنگھم پلیس کا ہم سر ہے۔ یہ محل ۱۹۱۳ء میں باقی گیٹ پل پر تعمیر کیا گیا تھا اس میں ۶۵ کمرے، بے شمار شاندار بال، درجنوں زینے اور دوسرے لوازمات ہیں کہا جاتا ہے کہ لندن میں یہ بکنگھم پلیس کے بعد دوسرا سب سے بڑا محل ہے، ایک برطانوی اخبار نے لکھا ہے کہ شاہ حسین نے اپنے ذاتی جیب خرچ کا کچھ حصہ اس محل کو خریدنے پر صرف کر دیا ہے، جو انگلستان کے شاہی خاندان کے لیے باعث رشک ہے، اس محل کی اہمیت کا اندازہ یوں لگائیے کہ ملکہ میری اور شہزادی الزبتھ اور مارگریٹ اکثر یہاں تقریبات کے سلسلے میں جایا کرتی تھیں شاہ حسین کا ایک ذاتی محل پہلے بھی لندن کے بیش قیمت کیننگٹن کے علاقے میں موجود ہے۔ ایک

سے زیادہ ہے۔ آپ جو ذہنی گرفت، جسمانی جھجکے اور ڈرائیور کی ڈانٹ ڈپٹ برداشت کرتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہے۔

کراچی میں ٹیکسیاں زیادہ نظر آتی ہیں اور لاہور والے انھیں کراچی کی سڑکوں پر بھاگتے ددڑتے دیکھ کر بہت مرعوب اور خوش ہوتے ہیں۔ ان ٹیکسی والوں کا سلوک بھی لاہور کے رکشہ ڈرائیوروں کے مقابلے میں قدرے بہتر ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لاہور کے ڈرائیوروں کی طرح یہ بھی مرضی کے مالک اور موڈی ہوتے ہیں۔ جی چاہا تو سواری بٹھالی۔ درنہ بے نیازی سے منہ موڑ کر چلے گئے۔ بہت زیادہ اخلاق برتنا تو رکھائی سے کہہ دیا۔

”ادھر نہیں جانا صاحب۔ ہم دوسری طرف جاتا ہے۔“

جہاں تک کراتے کا معاملہ ہے کراچی کے ٹیکسی والے چند سال قبل تک خاصے مقول تھے لیکن جوں جوں پولیس کی مہربانیاں بڑھتی گئیں ٹیکسی ڈرائیوروں کا رویہ بھی لاڈلے بچوں کی طرح کا ہو گیا۔ اب یہ عالم ہے کہ میٹر محض آرائش کی شے رہ گئی ہے۔ ڈرائیور بے رخی سے آپ کو دیکھتا ہے۔ جاتہ لیتا ہے۔ اگر مسافر معیار پر پورا نہیں اُترا تو خاموشی سے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اگر پورا اُترا تو کہہ دیا۔ ”میٹر سے پانچ روپے زیادہ ہوں گے۔“ اب ایک تو میٹر ہی ٹیکسی سے آگے بھاگنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس پر مزید اضافہ۔ مگر ضرورت مند سر جھکا دیتے ہیں۔ کیا کریں، مجبور ہیں!

ہم لاہور سے کراچی کے اتیر پورٹ پر پہنچے تو بیرونی لاؤنج میں ٹیکسی ڈرائیوروں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ یہ لوگ مسافر کو دیکھتے ہی خوشی سے باہیں اور ہاتھ پھیلا کر یوں آگے بڑھتے ہیں جیسے مدت کے بچھڑے ہوتے عزیز مل رہے ہیں۔ ”صاحب ٹیکسی!!“ یہ اور بات ہے کہ جس نے ”ہاں“ میں سر ہلادیا اس کی سمجھے شامت آگئی۔ آپ کے سامان پر متحد ٹیکسی والے چیلوں کی طرح جھپٹیں گے اور جس کے ہاتھ میں جو سامان آگیا اٹھا کر

ڈکریٹکسی کا !

جس طرح ہر ملک کا سیاسی اور سماجی نظام جدا ہوتا ہے اسی طرح ٹیکسیوں کا نظام بھی مختلف ہوتا ہے۔ ٹیکسی جدید تہذیب کا عطیہ ہے چنانچہ دنیا کے ہر ملک میں آپ کو ٹیکسی اور ٹیکسی والا نظر آجائے گا۔ مگر ہر ملک کی ٹیکسی والا دوسرے ملک کے ٹیکسی والے سے مختلف ہوتا ہے۔ انگلستان کے ٹیکسی والوں پر روشنی ڈالنے سے پہلے بہتر ہوگا اگر ہم اپنے ملک کے ٹیکسی والوں کے تذکرے سے اس قسط کا آغاز کریں۔

لاہور میں ٹیکسی اب عجائب گھر میں رکھنے کی چیز ہو گئی ہے۔ وہ ٹیکسی جسے ”یلو کب“ کہا جاتا ہے اور جو ابتدائی دنوں میں لاہور کی سڑکوں کی شان بڑھانے میں حصہ لیا کرتی تھی اب اس شہر میں ناپید ہو گئی ہے۔ کہیں کہیں مخصوص مقامات پر اکاؤ گاٹیکسیاں نظر آ جاتی ہیں مگر وہ عام مسافروں کو گھاس نہیں ڈالتیں۔ خدا جانے یہ ٹیکسیاں کن مسافروں کے انتظار میں کھڑی رہتی ہیں؟ اگر کبھی ریلوے اسٹیشن یا ائر پورٹ سے آپ کو ٹیکسی لینی ہی پڑ گئی تو آپ خود اپنے رسک پر ایسا کر سکتے ہیں۔ ٹیکسی والا آپ سے کتنا کرایہ وصول کرے گا اور منزل تک پہنچنے پر آپ سے کیا سلوک کرے گا؟ یہ خدا بہتر جانتا ہے یا خود ٹیکسی والا۔ لے دے کے اب لاہور والوں کو موٹر رکشوں پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔

اس موٹر رکشہ والے کا خزعہ اور کرایہ برداشت کرنا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں رہی ہے۔ یقین کیجئے کہ لاہور کی موٹر رکشہ کا کرایہ دنیا کے بیشتر شہروں کی بہترین ٹیکسیوں کے کراتے

"میٹر خراب ہے صاحب۔"
"پھر کراتے کا کیا ہوگا۔"

وہ مسکرایا۔ "جو آپ کی مرضی میں آئے اپنی خوشی سے دے دینا۔"

جب ہم ایئرپورٹ سے گلشن اقبال پہنچے اور ٹیکسی والے کو تیس روپے کا نذرانہ پیش کیا تو وہ نظروں پڑا کر بولا۔ "سو روپے ہوں گے صاحب۔" مگر لہجہ ایسا تھا کہ دیکھو سیدھی طرح سو روپے نکالو ورنہ تمھاری خیر نہیں ہے۔ پاس پڑ دس کا بھی خیال تھا۔ چپکے سے ہم نے سو روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیئے اور وہ شکر یہ ادا کیے بغیر ہمارے ہاتھ سے نوٹ چھین کر چلتا بنا۔ جن لوگوں کو پاکستان کی ٹیکسیوں میں سفر کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے وہ سب اس تجربے سے گزر چکے ہیں۔ گندی ٹیکسی۔ اس سے بھی گندا ٹیکسی ڈرائیور۔ میٹر بند یا خراب۔ یا اگر حرکت میں ہے تو اس تیزی سے حرکت کرتا ہوا کہ مسافر کے دل کی حرکت ہی بند کر دے۔ ٹو ٹیکسی والا آپ سے کہے گا۔ "جو مرضی آئے خوشی سے دے دینا۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جو میں کہوں وہ ادا کر دینا ورنہ۔۔۔

اس کے برعکس لندن ایئرپورٹ پر آپ کو مسافروں کی ایک لمبی قطار نظر آئے گی۔ یہ بس کے انتظار میں نہیں ہیں۔ رش کے وقت ٹیکسی کے منتظر ہیں۔ ٹیکسیاں باری باری آتی ہیں اور قطار میں سے مسافروں اور سامان کو لے کر رخصت ہو جاتی ہیں آواز دینے یا بلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اگر آپ چاہیں کہ رش کے اوقات میں قطار بندی کے باہر کھڑے ہو کر ٹیکسی حاصل کر لیں تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اور پھر زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑتا۔ بہت زیادہ ہجوم ہو پھر بھی چند منٹ میں قطار غائب ہو جاتی ہے۔ پھر آپ اس جواب کی توقع بھی نہیں کرتے کہ میں فلاں جگہ نہیں جا رہا۔ مجھے تو فلاں جگہ جانا ہے۔ اگر آپ لندن پہلی بار آتے ہیں اور اپنی باری

یہ جاوہ جا۔ اب مسافر کھڑا سوچتا رہ جاتا ہے کہ میں ادھر جاؤں یا ادھر جاؤں؟ یہ تو ابتدا ہے۔ منزل تک پہنچنے پر وہ ٹیکسی والا آپ سے کیا سلوک کرتا ہے یہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ اور خاص دیکھ بھری بھی۔ چنانچہ عقل مند مسافران حضرات کی بھیڑ کو کاتی کی طرح چیرتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور جواب میں صرف اتنا کہتے ہیں۔ "نیں بھائی۔ ہماری گاڑی آئی ہے۔"

چلیے۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کے ہر اول دنتے سے تو آپ محفوظ ہو گئے۔ اب آگے پہنچے تو دیکھا کہ عجیب نظارہ ہے۔ گنتی کی چند ٹیکسیاں ہیں اور بے شمار مسافر سامان کا انبار لگاتے کھڑے ہیں۔ جس ٹیکسی والے کو بلاتے ہیں پتہ چلتا ہے کہ وہ تو پہلے ہی کسی دوسرے مسافر کا سامان گاڑی میں لا رہا ہے۔ بھی ٹیکسی والے۔ بھائی ٹیکسی اے ٹیکسی ٹیکسی کہہ کر جب حلق خشک ہو گیا تو ایک ٹریفک کانٹیل کے کانوں تک ہماری فریاد پہنچ گئی۔ اس نے پوچھا "صاحب۔ ٹیکسی چاہتے؟" حالانکہ صاحب سو ٹیکس اور سامان کے ڈھیر میں دبے ہوئے تھے اور "ٹیکسی، ٹیکسی" پکارتے ہوئے ہماری آواز بیٹھ چکی تھی۔ خیر۔ کانٹیل کی اس نوازش پر ہم مسکراتے اور سر ہلا دیا۔ "اے چین دین۔ ٹیکسی میں صاحب کا سامان رکھو۔ جلدی۔"

کانٹیل نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو آواز دی۔ چین دین نے چھٹ پٹ ہمارا سامان گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دھر دیا۔ ہمیں اگلی سیٹ پر بٹھایا اور رخصت ہو ہو گیا۔ ہم کانٹیل کے احسان کے بوجھ تلے اتنے دبے ہوئے تھے کہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔ اب دیکھتے نا۔ اس طرح کراچی ایئرپورٹ پر محض بیس منٹ کے بعد ٹیکسی کا بل جانا خوش نصیبی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ تو ہم نے چند میل کا سفر طے کرنے کے بعد دیکھا کہ ٹیکسی کا میٹر بند ہے۔ "ارے بھئی۔ میٹر تو چلاؤ ہم نے گھبرا کر کہا۔"

انتظار کیے بغیر ٹیکسی کیلئے پریشان ہیں تو ٹیکسی ڈرائیور آپ کو قطار میں کھڑے ہونے کا مشورہ دے گا۔ اسی کو آپ انکار سمجھ لیجئے۔

لندن کی ٹیکسیاں ساری دنیا کی ٹیکسیوں سے مختلف ہیں۔ ساہماں سال سے ان کی موجودہ شکل و صورت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ سیاہ رنگ کی بدشکل ٹیکسی ہوتی ہے مگر آرام آسائش اور گنجائش کے اعتبار سے دنیا کی بہترین ٹیکسی ہے۔ جتنے آرام سے پیر پھیلا کر بیٹھنے کی جگہ اس بدشکل ٹیکسی میں ہوتی ہے آپ کو مرستہ زیادہ دیر تک میں بھی نہیں ملے گی۔ ان ٹیکسیوں میں ڈگنی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اگر سامان کم ہے تو اپنے ساتھ ہی رکھ لیجئے۔ اس میں پانچ مسافروں کے آرام سے بیٹھنے کی گنجائش بھی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور اور مسافر کے درمیان ایک حد فاصل ہے آپ شیشہ کھسکا کر ڈرائیور آپ کی گفتگو سُننے سے قاصر ہے۔ گویا صحیح معنوں میں یہ ایک پرائیویٹ سواری ہے جس میں بیٹھ کر آپ ٹیکسی ڈرائیور کو ہرا ز بناتے بغیر ہر قسم کی گفتگو بلا خوف و خطر کر سکتے ہیں۔ ڈرائیور کے ساتھ اور کوئی سیٹ نہیں ہوتی۔ البتہ کھلی جگہ ضرور ہوتی ہے جہاں اتنا سامان رکھا جاسکتا ہے جو دوسری تین چار ٹیکسیوں میں بھی نہیں رکھا جاسکتا۔ سامان کے لیے آپ کو علیحدہ کرایہ ادا کرنا ہوتا ہے جو بہت زیادہ نہیں ہوتا۔ کرایہ آپ کی آنکھوں کے سامنے چپاں ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا ٹیکسی ڈرائیور کے لیے ممکن نہیں ہے۔ میٹر میں نے کبھی لندن کی کسی ٹیکسی کا خراب نہیں دیکھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کا دائرہ ریس کے ذریعہ اپنے دفتر سے مسلسل رابطہ قائم رہتا ہے اور وہ مختلف قسم کی ہدایات سننا رہتا ہے۔

لندن میں ٹیکسی حاصل کرنے کے بھی آداب ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں انگلستان میں ٹریفک باتیں ہاتھ پر چلتا ہے۔ اس لیے ڈرائیور دائیں ہاتھ پر ہوتا ہے آپ جیسے ہی خالی ٹیکسی کو اشارہ کرتے ہیں اس کے لیے لازم ہے کہ رُک جائے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ

ٹیکسی ڈرائیور کسی مسافر کے اشارے کو نظر انداز کر کے گزر جاتے۔ خواہ رات اور دن کا کوئی پیر ہو اور موسم کتنا ہی خوشخوار کیوں نہ ہو۔ کوئی سنسان ویران شاہراہ ہو یا گنجان آبادی۔ ٹیکسی ڈرائیور آپ کے اشارے پر رُکنے کا پابند ہے اب آپ کا کام یہ ہے کہ ٹیکسی کے نزدیک جائیں۔ ڈرائیور دائیں ہاتھ پر بیٹھا ہے مگر وہ بائیں ہاتھ والے دروازے کی کھڑکی کا شیشہ اُتار کر آپ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے آپ بلند آواز میں، کھڑکی کے نزدیک منہ لے کر اپنی منزل مقصود بتاتے ہیں اور ٹیکسی کا پھیلا دروازہ کھول کر بلاتال ٹیکسی میں سوار ہو جاتے ہیں۔ اس کا ایک مقصد غالباً یہ بھی ہے کہ مسافر کی آواز وائرلیس کے ذریعہ دفتر تک پہنچ جاتی ہے اور انہیں علم ہو جاتا ہے کہ کس نمبر کی ٹیکسی اب کس طرف جا رہی ہے!! لندن کے ٹیکسی ڈرائیور کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ شہر کی ہر سڑک محفے اور گلی کوچے سے بخوبی واقف ہو۔ مسافر نے جو پتہ بتایا ہے وہ سیدھا وہاں پہنچ کر دروازے کے عین سامنے رُک جاتے گا۔ آپ اسے مقرر کرایہ ادا کریں تو وہ خندہ پیشانی سے ”تھینک یو“ کہے گا۔ حالانکہ آپ نے ٹپ نہیں دی ہے۔ اگر آپ اپنی خوشی سے چند پینی بطور ٹپ دیں گے تو اس کے ”تھینک یو“ میں گرجو شکی بھی پیدا ہو جائے گی۔

ان سیاہ بدشکل لیکن انتہائی آرام دہ ٹیکسیوں کے علاوہ لندن میں مٹی ٹیکسیاں اور ریڈیو ٹیکسیاں بھی موجود ہیں۔ آپ فون کریں اور چند لمحے بعد ٹیکسی آجائے گی۔ دراصل انٹر والے آپ کے علاقے میں موجود ٹیکسی ڈرائیور والے کو ہدایت نشر کر دیتے ہیں درجوبھی ٹیکسی ”موقعہ داروات“ کے نزدیک سے گزر رہی ہو وہ دفتر کو مطلع کرنے کے بعد مسافر کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ یہ ٹیکسیاں عام کاروں کی طرح ہوتی ہیں۔ کرائے ان کے نام فرق ہے لیکن آسانی بہت زیادہ ہے۔ ریڈیو ٹیکسیوں کی یہ سہولت دُنیا کے دوسرے شہروں میں بھی مہیا ہے۔ لیکن ہمارے شہر دوسرے ملکوں کے لیے بڑے

دوست کے ساتھ ایک ٹاؤن سے ہانسلو ویٹ جا رہے تھے۔ ایک ٹیکسی والے کو اشارہ دے رک تو گئے مگر چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ خدا جانے گھر سے لڑ کر آتے تھے یا گرل فرینڈ نے ڈانٹا تھا (اس لیے کہ سنتری بادشاہ اور ٹریفک کے سپاہی کے ہاتھوں تنگ ہونے کا تو یہاں تصور ہی نہیں کیا جاسکتا)۔ بہر حال ہم نے حسب دستور اپنی منزل مقصود بتائی اور اپنے دوست کے ساتھ ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ یہ دوست پہلی بار لندن گئے تھے اور لندن کی سیاہ ٹیکسی میں سوار ہونے کا ان کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بار بار پریشانی سے ہم سے پوچھتے رہے۔

”پتہ آپ نے پورا بتا دیا ہے نا؟ وہ پتہ جانتا بھی ہے یا نہیں؟ وغیرہ۔“
ان کی تسلی کے لیے ہم نے درمیانی شیشہ ہٹا کر ٹیکسی ڈرائیور کو دوبارہ پتہ بتایا۔
جواب میں وہ خاموش رہا لیکن خوشخوار نظروں سے گھوم کر دیکھا۔ ہم نے جھٹ شیشہ بند کر دیا۔ تھوڑی مسافت اور طے ہوئی مگر ہمارے دوست کے دل کو سکون نہیں تھا۔
انہوں نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔ شیشہ کھسکا کر ڈرائیور سے مخاطب ہوئے۔ ”سنو! تم پتہ سمجھ تو گئے ہونا۔ ٹیوب اسٹیشن سے کچھ دُور آگے چل کر بائیں ہاتھ...“
ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی برہمی سے چیخ کر کہا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اپنا منہ بند رکھو۔“

ہمارے دوست تو خیر بھونچے رہ گئے لیکن ٹیکسی ڈرائیور کا یہ رویہ ہمارے لیے بھی حیران کن تھا۔ ہمارے دوست بھی کچھ دیر میں سنبھل چکے تھے۔ غصے سے برے چلانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم آرام سے بات نہیں کر سکتے؟
ٹیکسی ڈرائیور دھاڑ کر بولا:

”سٹ آپ۔ ورنہ ایسا گھونٹہ رسید کروں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گے۔“

ہم نے بات کو بگڑتے دیکھا تو فوراً درمیانی شیشہ بند کر دیا۔ ہمارے

شہر کی دوسری خوبیوں کی طرح اس بنیادی سہولت سے بھی محروم ہیں۔
لندن کے ٹیکسی ڈرائیور کی آمدنی بہت مقبول ہے۔ تنخواہ بہت اچھی ملتی ہے اور ٹاؤن اس سے بھی زیادہ مقبول ہے۔ تنخواہ کے علاوہ کمیشن بھی مل جاتا ہے۔ لیکن ٹیکسی ڈرائیور بنا آسان نہیں ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ڈرائیورنگ کا امتحان تو خیر دنیا ہی پڑتا ہے۔ (جو انتہائی مشکل ہوتا ہے) لیکن اس کے علاوہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شہر کے ہر علاقے سے واقف ہو۔ امتحان کے وقت انسپکٹر کسی ایک جگہ کا نام لے گا۔ اب ٹیکسی ڈرائیور کا فرض ہے کہ وہ قریب ترین راستے سے گزر کر منزل تک پہنچے۔ اگر وہ پتہ نہیں جانتا تو امتحان میں فیل ہو جائے گا۔ اور اگر نزدیکی راستہ چھوڑ کر لمبا راستہ اختیار کرے گا پھر بھی پاس نہیں ہوگا۔

لندن والوں کے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی اس خوبی پر ناز ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دنیا کے دوسرے کسی شہر کے ٹیکسی ڈرائیور شہر کے نقشے اور علاقوں سے اتنے واقف نہیں ہوتے جیسے لندن کے ٹیکسی ڈرائیور ہوتے ہیں۔ پھر ایک اور بات یہ ہے کہ کبھی ٹیکسی والا آپ کو سڑک کے دوسری طرف نہیں اتارے گا کہ وہ رہی آپ کی منزل۔ چلے جاتیے بلکہ وہ اس مکان کے عین سامنے دروازے پر ٹیکسی روکے گا اور آپ کو بتائے گا کہ آپ کی منزل آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ لندن کے ٹیکسی والوں کی ایک خصوصیت ان کا اخلاق اور نرم گفتاری بھی ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس بار ہمیں چند ایسے ٹیکسی ڈرائیوروں سے بھی واسطہ پڑا جو لندن کے روایتی ٹیکسی ڈرائیور سے یکسر مختلف تھے۔ یہ تجربہ ہمارے لیے حیران کن بھی تھا اور ناقابل یقین بھی ثابت ہو کہ لندن میں بھی ٹیکسیوں کا نظام رو بہ انحطاط ہے۔ چند مثالیں آپ کی دلچسپی اور معلومات کے لیے پیش خدمت ہیں۔

بارش ہو رہی تھی اور لندن کی سڑکوں پر ٹریفک کا جھوم تھا۔ ہم اپنے ایک

”یہ کون سی جگہ ہے؟ یہ کس راستے سے ہمیں لے جا رہا ہے؟“

ہم نے کہا۔

”بھاتی وہ ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ لندن کے راستے ہم سے بہتر جانتا ہے۔“

کچھ دیر اور ٹیکسی چلتی رہی اور ہم ڈرائیور پر اعتماد کیے بیٹھے رہے۔ مگر پندرہ منٹ بعد احساس ہوا کہ ہم نہ جانے کس علاقے سے گزر رہے ہیں۔ ٹرکس سنان اور ویران، عمارتیں نامانوس، ہم نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

”ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟ یہ کون سا راستہ ہے؟“

ٹیکسی ڈرائیور بھی اب کچھ کنفیوز ہو گیا تھا بولا۔

”شاید میں راستہ بھول گیا ہوں۔“

افضل نے انہیں فوراً ہدایات دینی شروع کر دیں مگر بیس منٹ بعد ہم

پھر کہیں بھٹک رہے تھے۔

ہم نے کہا۔

”تم یوں کرو کہ ہینٹر وائر پورٹ کی طرف چلو۔ پھر ہم یہیں راستہ بتا

دیں گے۔“

پتہ چلا کہ وہ ہینٹر وائر پورٹ کا راستہ بھی نہیں جانتا۔ یہ لندن کا پہلا

ٹیکسی ڈرائیور ہمیں ملا تھا جو ہینٹر وائر پورٹ کا راستہ بھی نہیں جانتا تھا۔ ایک جگہ

چنڈرل کے لڑکیوں کو غل بچاتے اور گانے گاتے ہوتے دیکھا تو ہم نے فوراً کہا۔

”ٹیکسی روک کر ان سے پتہ معلوم کرو۔“

ڈرائیور نے تعمیل کی۔ کافی دیر وہ ان لوگوں کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے کے بعد

واپس آیا اور بولا۔

”بس ٹھیک ہے۔“

دوست سخت ناراض تھے۔ کہنے لگے۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے۔ یہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ میں اس کی شکایت

کروں گا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے دوبارہ درمیانی شیشہ پٹا کر ڈرائیور سے بات کرنے کی

کوشش کی۔ مگر ہم نے انہیں روکا اور کہا کہ بھاتی شکایت کرنی ہے تو میز نوٹ کر

لو۔ بلاوجہ جھگڑا کرنے سے کیا فائدہ؟ شکر ہے کہ وہ ہماری بات مان گئے۔ دوسرے

بہ بات بھی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور خاصا مضبوط اور ہٹا کتا تھا۔ ہو سکتا ہے پاکستانگ

کا بھی ماہر ہو۔ بہتری اسی میں تھی کہ خاموش ہو جاتیں۔ منزل پر پہنچ کر ہم نے مقررہ

کرایہ ڈرائیور کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے نہایت بداخلاقی سے نوٹ ہمارے

ہاتھ سے چھینے اور گھورتا ہوا منہ میں بڑبڑاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ ہم حیران کھڑے

دیکھتے رہے کہ یا اللہ۔ یہ ہم لندن میں کھڑے ہیں یا لاہور میں؟ ٹیکسی ڈرائیوروں

کی گھر کیوں، جھڑکیوں اور دھمکیوں کے ہم بے شک عادی ہیں مگر یہ سلوک لاہور اور کراچی

میں ہمارے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ کیا لندن میں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟ واقعی حیرانی کی

بات ہے۔

دوسرا واقعہ سن لیجئے پکا ڈٹی میں فلم دیکھ کر ایک اداکار دوست افضل صاحب

کے ساتھ باہر نکلے۔ رات کافی گزر چکی تھی ہفتہ کی رات بھی تھی اس لیے خالی ٹیکسی

دُور دُور تک نظر نہیں آتی تھی۔ ایک ہوٹل سے ہم نے ٹیکسی طلب کرنے کے لیے فون کیا اور

دس منٹ بعد ایک سیاہ فام شخص نمودار ہوا۔ ان صاحب کا فلق نا تجربا سے نکلا۔

انہوں نے مطلع کیا کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور ہیں۔ ہم خاموشی سے ان کی ٹیکسی میں سوار ہو

گئے۔ اب انہوں نے جو ٹیکسی چلائی شروع کی تو لندن کی کوئی سڑک نہیں چھوڑی جس

پر سفر نہ کیا ہو۔ افضل صاحب ہم سے پوچھنے لگے۔

ہم نے ٹیکسی ڈرائیور پر بھروسہ نہیں کیا۔ خود اس غول بیابانی کے پاس گئے۔ ہمیں دیکھ کر لڑکے لڑکیوں نے فیرے مارنے شروع کر دیئے۔
”وہ آگئے وہ آگئے۔“

پھر انھوں نے تالیاں بجا بجا کر ”وہ آگئے“ کا نغمہ کورس میں گانا شروع کر دیا۔ ہم ان کے خاموش ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جب ان کی نغمہ سرائی بند ہوتی تو ان سے ہیتھرو ایئر پورٹ کا راستہ پوچھا۔ ایک لڑکے نے بائیں جانب جانے کا مشورہ دیا۔ دوسری لڑکی نے لڑکھڑاتے ہوئے دائیں جانب جانے کو کہا۔ ایک درمیانی عمر کے صاحب خاموشی سے اُٹھ کر ہمارے پاس آئے۔ نہایت سنجیدگی سے انھوں نے ہمیں راستہ سمجھایا۔ ہم بہت خوش ہوتے کہ ان مدہوشوں میں ایک صاحب ہوش بھی موجود ہے۔ مگر جب ہم ان کا شکریہ ادا کر کے پلٹے تو انھوں نے اچانک ایک نعرہ زندانہ لگایا اور ددڑ کر ہماری ٹیکسی کی چھت پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور پھر جو انھوں نے شور مچایا ہے تو بمشکل دوسرے لڑکے لڑکیوں نے انھیں زبردستی پکڑ کر ٹیکسی کی چھت سے اتار اور نہ وہ شاید صبح تک وہیں بیٹھ کر نغمہ سرائی کرتے رہتے۔ مگر انھوں نے پتہ درست بتایا تھا۔ چند منٹ بعد ہم ایم فور پر پہنچ گئے اور وہاں سے گھر کا راستہ مل گیا۔ رات کے تین بجے فلیٹ کے سامنے ٹیکسی رُکی تو انضال صاحب پوچھنے لگے۔
”کراہی تو بہت بن گیا ہے۔ اس کو کیا دوں؟“

ہم نے مشورہ دیا۔

”اس کو گالیاں دے کر بھگا دو۔“

کنسے لگے۔

”گنہیں آفاقی صاحب۔ یہ بے چارہ لندن میں نیا ہے اور غریب طبیعت لگتا ہے۔ پھر تیسری دنیا کی مخلوق ہے۔ اس کو پچیس پونڈ دے دیتے ہیں۔“ حالانکہ صبح کراہی

”راستہ سمجھ تو گئے ہونا؟“

”بالکل۔ بالکل۔ فکر ہی نہ کریں۔“

اس کے بعد اس نے پھر ہمیں سڑکوں پر گھانا شروع کر دیا۔ اب رات کے دو بجے والے تھے۔ بارش اور سردی بھی تھی۔ نیند بھی آ رہی تھی۔ اوپر سے راستہ نہ ملنے کی کوفت۔ دس پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد معلوم ہوا کہ راستہ اب بھی نہیں ملا ہے۔ انضال صاحب نے ڈرائیور کو خوب ڈانٹا۔

”تم کیسے ڈرائیور ہو؟ لندن کی سڑکوں کو نہیں جانتے۔ ہیتھرو ایئر پورٹ کا راستہ نہیں جانتے۔“

آدمی شریف تھا۔ خاموشی سے ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہا پھر بولا۔

”میں نا تھیریا سے نیا آیا ہوں۔“

”تمہیں ٹیکسی ڈرائیور کس گدھے نے بنا دیا ہے۔ تم نے تو ہماری رات

خراب کر دی۔“

وہ چُپ رہا۔ مگر ٹیکسی حرکت میں رہی۔ میٹر کی طرف دیکھا تو وہ چھلانگیں لگا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے لمبے سفر کے بعد کراہی تو بڑھنا ہی تھا۔ منزل کا اب تک کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔

ایک جگہ پھر ہمیں فرشتوں کا غول مل گیا۔ اس بار لڑکے لڑکیاں سڑک کے بیچوں بیچ بارش میں بیٹھے ہوئے گا رہے تھے۔

”روکو۔ روکو۔ ٹیکسی روکو۔“

ٹیکسی ڈرائیور کا انارڈی پن ملاحظہ فرمائیے کہ سائیڈ میں روکنے کی جگہ اس نے

اسی جگہ بریک لگا دیا

وہ تو خدا کا شکر ہے کہ سڑک پر کوئی ٹریفک نہ تھا ورنہ خیر نہ ہوتی۔ اس مرتبہ

”ہم خواہ مخواہ اپنے لاہور کے ٹیکسی والوں کو بُرا کہتے ہیں۔ دیکھا آپ نے لندن کے ٹیکسی والے کتنے برتیز اور ذلیل ہیں۔ بالکل جنگلی۔ انھیں تو عورتوں سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔“

وہ اُردو میں بات کر رہی تھیں جب انھیں گرجے برتے کافی دیر ہو گئی تو انگریز ٹیکسی ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھا اور نہایت خوش اخلاقی سے اُردو میں کہنے لگا۔

”بیگم صاحبہ، سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔“

اگر بیگم صاحبہ اور ہم پریم پھٹا ہوتا تو شاید ہم اتنے پریشان نہ ہوتے۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ دراصل بیگم صاحبہ اتنی دیریں لندن والوں کی شان میں بہت زیادہ گستاخی کر چکی تھیں اور جب ہمیں احساس ہوا کہ یہ انگریز تو سب کچھ سمجھ رہا تھا تو سخت شرمندگی ہوئی۔ بعد میں خاصی تفصیل سے گفتگو ہوئی یہ انگریز ڈرائیور گلگتہ میں پیدا ہوا تھا اور بائیس سال کی عمر تک وہیں رہا تھا۔ اس لیے اُردو خوب بولتا اور سمجھتا تھا۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ٹیکسی والے بھانت بھانت کے ہوتے ہیں۔ روم میں ٹیکسی والے سے ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ وہ آپ کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طویل ترین راستے سے منزل پر لے جاتے گا۔ ایک بار تو ہم نے رات کو دس پندرہ میل کا کرایہ ادا کیا اور صبح دیکھا کہ ہم جہاں سے رات آتے تھے وہ جگہ ہمارے ہوٹل کے عقب میں ہی تھی اور ہمارے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتی تھی۔ روم کے ٹیکسی والے انگریزی ”سین اور نو“ سے زیادہ نہیں جانتے۔ انگریزی یہ دینا پسند بھی نہیں کرتے اگر آپ کسی بات کی شکایت کریں گے تو وہ اطالوی زبان میں ایک لانتنا ہی تقریر شروع کر دیں گے۔ بار بار اسٹیننگ کو چھوڑ کر ہاتھوں کے اشارے کریں گے اور نان اسٹاپ بولتے رہیں گے یہاں تک کہ آپ کی منزل آجائے گی اور آپ کان دبا کر کرایہ ادا

دس بارہ پونڈ سے زیادہ نہ بنتا۔

ہم نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔
”تمہیں کتنے پیسے ادا کریں؟“

وہ مسکرا کر چپ ہو گیا۔ پچیس پونڈ ملے تو اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ ڈھیر سا راتشکریہ ادا کر کے وہ جانے لگا تو ہم نے اسے واپسی کا پتہ پھر تفصیل سے سمجھایا اور وہ شکریہ ادا کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ بعد میں ہم نے جب یہ واقعہ لندن میں رہنے والوں کو سنایا تو انھیں قطعی یقین نہ آیا۔ مگر ہمارے پاس ایک چشم دید گواہ بھی موجود ہے۔

ایک بار ہم نے رات گئے ریڈیو ٹیکسی ایک ہوٹل سے فون کر کے طلب کی۔ یہ سٹرڈے نائٹ تھی اور ہم خالی ٹیکسی کی شکل کو ترس گئے تھے۔ ہمارے ساتھ چند خواتین بھی تھیں جن میں سے ایک اداکارہ ہیں۔ یہ بھی پکا ڈلی سرکس کا واقعہ ہے۔ رات خالی گزر چکی تھی۔ اس سے پہلے فلم ایگٹس خاتون نے ایک خالی ٹیکسی کھڑی دیکھی تو پاس جا کر دریافت کیا۔ ”ٹیکسی خالی ہے۔“ رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا اور اخبارات کے تازہ ایڈیشن فروخت ہو رہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی اطمینان سے ٹانگیں پھیلاتے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس نے خاتون کے سوال کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ دوسری بار چکر کاٹ کر اس کی کھڑکی کے پاس گئیں اور بولیں۔

”ہیلو۔ ہیلو ایکسیوز می۔۔۔۔“

ٹیکسی ڈرائیور نے اخبار سے نظریں اٹھا کر دیکھا اور غصے سے بولا۔ ”گم ہو جاؤ“ اور پھر اخبار بینی شروع کر دی۔ اس حرکت پر ہماری ہم سفر بہت برہم تھیں اور جب ہم ریڈیو ٹیکسی میں بیٹھے جا رہے تھے تو وہ لندن کے ٹیکسی ڈرائیوروں پر برس رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

سیاہ فام لوگوں کی۔ پھر وہ ٹیکسی چلاتے ہوئے اکثر سگریٹ نوشی کرتے رہتے ہیں اور مسافر سے معذرت تک نہیں کرتے۔ کافی یا کوک کا ڈبہ پیتے ہوئے تو اکثر ٹیکسی ڈرائیور گاڑی چلاتے ہوئے نظر آجائیں گے۔ حالانکہ یہ جرم ہے۔ آپ شاید یقین نہ کریں لیکن ایک بار ہم نے رات کے وقت واشنگٹن میں ایک ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا جو ہم سے تھوڑا آگے جا رہا تھا اور آم کھا رہا تھا۔ ہے نا تعجب کی بات!؟

انڈیا ہم آزادی کے بعد نہیں گئے۔ مگر سنا ہے کہ وہاں ٹیکسیاں کباڑی کا مال نظر آتی ہیں۔ ٹوٹی چھوٹی اور گندی۔ ڈرائیور بھی ویسا ہی۔ مگر بد اخلاقی نہیں کرتے۔ البتہ مسافر کو چکر دینے میں مصافقہ نہیں سمجھتے۔ دنیا میں بہترین ٹیکسیاں اور ٹیکسی ڈرائیور جاپان کے ہوتے ہیں۔ مگر یہ مذکرہ ہی بے کار ہے۔ آج کل تو جاپان کی ہر چیز ہی نمبر اول ہے۔

کولمبو میں ٹیکسیاں عمر کا مورس پندرہ سو ملیں گی۔ اتنی بوسیدہ کہ لگتا ہے ہاتھ لگاتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی۔ ڈرائیور اس سے بھی زیادہ بد حال ٹیکسی چلتی ہے تو لگتا ہے زلزلہ آگیا ہے۔ مگر ان کے میٹر اکثر درست ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی ٹیکسی ڈرائیور خراب میٹر ظاہر کر کے زبانی کرایہ طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ظاہر ہے کہ زیادہ ہوتا ہے۔ بنکاک میں میٹر کا رواج ہی نہیں ہے۔ موٹر رکشہ اور ٹیکسی والے سے باقاعدہ پیشگی کرایہ طے کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے دکانداروں کی طرح یہ بھی مول تول کرتے ہیں۔ دوسو بھات سے شروع ہو کر تیس چالیس بھات پر بھی رضامند ہو جاتے ہیں۔ گویا نا تجربہ کار اور اجنبی مسافروں کی شامت ہے۔ ٹیکسیاں عام طور پر پُرانی اور خستہ ٹیکسی ڈرائیور بھی ان سے متوجہ کرتے ہوتے۔ البتہ ایک خاص بات ہم نے یہ دیکھی کہ بنکاک کی پُرانی ٹوٹی چھوٹی ٹیکسیوں میں بھی ایئر کنڈیشننگ لگا ہوتا ہے اور ٹکف کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے وہ کوئی اضافی کرایہ وصول نہیں کرتے۔ غالباً اس لیے کہ بنکاک میں عموماً موسم گرم ہوتا ہے اور ٹیکسیوں کی کمی نہیں ہے۔ اس لیے مسافر ایئر کنڈیشننگ ٹیکسیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

کرنے میں ہی عافیت سمجھیں گے۔ پیرس میں ٹیکسیاں بہت اچھی اور صاف ستھری ہوتی ہیں۔ جدید ماڈلز کی قیمتی کاریں ٹیکسی کے طور پر چلتی ہیں۔ ڈرائیور بھی صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ پیرس میں اگر آپ خاتون ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے تو بد ہوش کن خوشبو آپ کو مفت سونگھنے کو ملتی ہے۔ پیرس کے سیاہ فام ٹیکسی ڈرائیور زبان سے فائدہ اٹھاتے ہیں جب مناسب سمجھتے ہیں انگریزی سے نا بلد بن جاتے ہیں ایک بار ہم ایئر پورٹ سے ہوٹل پہنچے تو ڈالر ہی ہمارے پاس موجود تھے۔ ہم نے بلیک ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا کہ ان بیس ڈالرز میں کتنے فرانکس ہوں گے، اُس نے فرانسیسی زبان میں کچھ کہا اور ہمارے ہاتھ سے نوٹ لے کر چلتا بنا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کرایہ سات آٹھ ڈالر سے زیادہ نہیں لیتا تھا۔ پیرس میں اگر آپ کو ایشیائی خصوصاً پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور مل جائے تو جلدیے عید ہوگئی۔ آپ کی بھی اور ٹیکسی ڈرائیور کی بھی۔ اتنی گرجوشی اور خلوص سے ملے گا اور باتیں کرے گا کہ آپ جذباتی ہو جائیں گے۔ ایک بار ایک گوجرانوالہ کے لڑکے نے (جو دس سال سے پیرس میں تھا) ہم سے نہ صرف کرایہ وصول نہیں کیا بلکہ بچوں کو ٹافنی کا پکیٹ بھی پیش کیا۔ ہم نے بہت روکا اور کہا: بھئی یہ کیا ہے۔“ بولا۔

”چاچا کی طرف سے تحفہ“

جینوا کے ٹیکسی والے بھی اپنی ٹیکسیوں کی طرح صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ مگر ایک بار جینوا میں بھی ایک ٹیکسی والے نے ہمیں لمبا چکر دے کر زیادہ کرایہ وصول کیا۔ جس کسی کو ہم یہ واقعہ بتاتے ہیں وہ یقین نہیں کرتا حالانکہ یہ حقیقت ہے۔ یورپ کے ممالک میں ٹیکسیاں بھی نہایت عمدہ ہوتی ہیں اور ٹیکسی والے بھی مگر امریکہ کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا۔ یہاں پر ٹیکسی والے عموماً بااخلاق تو ہوتے ہیں اور کرایہ بھی زیادہ وصول نہیں کرتے مگر ٹیکسیاں صاف ستھری نہیں ہوتیں۔ خصوصاً

وہ بہت زیادہ پسند کیے جاتے تھے۔ کہتے ہیں انھوں نے ایک ماہ میں دو ناولوں کے اداسطے بھی لکھا ہے۔ اور بعض اوقات ایک ماہ میں کئی کئی ناول لکھ ڈالے۔ ان کے ناول پڑھنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ پبلشروں کے ستم سے محفوظ رہنے کی خاطر انھوں نے اپنے ناولوں کو بذاتِ خود شائع کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور غالباً اپنے دوسرے ہم عصروں کے مقابلے میں انھوں نے اپنی تحریروں سے کہیں زیادہ روپیہ کمایا۔ اب ذرا یہ ملاحظہ فرمائیے کہ بیرونی، خصوصاً ترقی یافتہ اقلیم باقیہ ملکوں میں لکھنے والوں کی کتنی پذیرائی ہوتی ہے اور وہ کتنی دولت کماتے ہیں؟ ٹائمز لندن نے ایک جائزے میں لکھا کہ ساری دنیا میں صنعت کاروں، اسمگلروں اور تیل کے تاجروں کے علاوہ اب ارب پتیوں کی ایک نئی قسم پیدا ہو چکی ہے۔ یہ مصنف ہیں، ناولیں اور کتابیں لکھنے والے لوگ، جن کی تصنیفات کروڑوں کی تعداد میں بکتی ہیں اور انھیں راتنی کے طور پر اربوں ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے۔ ان مقبول لکھنے والوں کے پاس ہر وہ نعمت اور آسائش ہے جو دوسرے دولت مندوں کو مہیا ہے۔ کئی ملکوں میں شاندار مکانات، گاڑیں، ہوائی جہاز، کچھ ناول نگاروں نے تو اپنے پسندیدہ مقامات پر پورے پورے جزیرے خرید لیے ہیں اور وہاں بیٹھ کر زندگی کی آسائشوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں یا پھر لکھتے ہیں مصروف رہتے ہیں۔ یہ نہ سمجھتے کہ اتنی دولت کمانے کے لیے انھیں مسلسل اور متواتر لکھنا پڑتا ہے۔ جی نہیں۔ کسی مصنف کا ایک ناول اگر مقبول ہو جائے تو وہ کروڑ پتی بن جاتا ہے۔ ترقی یافتہ معاشرہ کی یہی پہچان ہے۔ ایسے معاشرے اپنے ادیبوں اور فن کاروں کو غم و غمناک سے مکمل طور پر آزاد کر دیتے ہیں۔ انھیں سسک سسک کر اور ریگ ریگ کر زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کرتے۔

انگلستان میں انگریزی کی مقبول اور محبوب مصنف باربرا کارٹ لینڈ کی ۸۳ ویں

آرپ پتی مصنف

کتابیں اور ناول ہمارے ملک میں بھی لوگوں نے لکھے ہیں اور بہت زیادہ لکھے ہیں۔ پاکستان کے زودترین لکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ایک ایک دن میں دو دو تین افسانے لکھ ڈالتے تھے۔ انھیں بیس منٹ میں ایک افسانہ لکھتے ہوتے ہم نے بھی دیکھا ہے۔ ان کی کتاب ”گنجے فرشتے“ میں شامل بیشتر خاکے انھوں نے روزنامہ ”آفاق“ لاہور کے لیے لکھے تھے۔ ان میں سے بعض خاکے انھوں نے اس طرح لکھے کہ اخبار کے دفتر میں آتے، کرسی پر اگر طوں بیٹھے، قلم اٹھایا اور قلم برداشتہ لکھنا شروع کر دیا۔ وہ جب ایک بار لکھنا شروع کرتے تھے تو اس افسانے یا خاکے کو مکمل کر کے ہی اٹھتے تھے۔ انھوں نے اپنی کوئی تحریر دو نشستوں میں نہیں لکھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی ناول نہ لکھ سکے۔ ایک بار سے زیادہ بیٹھ کر کوئی چیز لکھنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کی بے چینی، مضطرب مزاجی اور پارہ صفتی طویل اور مسلسل تحریروں کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ منٹو صاحب نے بہت زیادہ لکھا اور زیادہ تر بہت خوب بھی لکھا لیکن اس کے عداوت میں انھیں کیا ملا؟ ان کی کتابیں کتنی تعداد میں شائع ہوئیں؟ اور ان کی اشاعت سے انھیں یا ان کے خاندان کو کتنا پیسہ ملا؟ شاید ہزاروں بھی نہیں۔

پاکستان کے ایک اور مقبول مصنف ابن صفی مرحوم گزرے ہیں۔ نوعمر نسل میں

ادا کیا ہے۔ ان کی آمدنی کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ ان کی تازہ ترین ناول ہنگی کتابی صورت میں ۷۰ ہزار سے زائد بک چکی ہے۔ سستی طباعت میں اس کی فروخت لاکھوں میں ہے۔

ہمارے ہاں ادبی حلقے اس بات پر ماتم کناں رہتے ہیں کہ ادبی تصانیف کے مقابلے میں ہلکی ٹھیک کی ناولیں زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ انگلستان میں بھی صورت حال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ جین آسٹن، چارلس ڈکنز، ڈی ایچ لارنس، ایولین واک جیسے معتبر ادبی جہاتوں کی کتابوں کے مقابلے میں جدید مصنفوں کی کتابیں بہت زیادہ فروخت ہو رہی ہیں۔ ای ایم فارسٹر کی کتاب ”اسے پیسج ٹو انڈیا“ اس سال فروخت کا نیاریکارڈ قائم کرنے والی ہے۔ ڈیوڈ ایٹن برڈ کی کتاب ”یونگ پلانٹ“ کی (ہنگی طباعت میں) پانچ لاکھ کے قریب جلدیں فروخت ہو چکی ہیں سستی کتابوں کی فروخت اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ پبلشراب ایسی کتابوں کی تاک میں رہتے ہیں جو بہت زیادہ بکتی ہوں۔ ایک ناشر کا کہنا ہے کہ اس کے منافع کا نوے فیصد حصہ ہلکی ٹھیک ناولوں سے حاصل ہوتا ہے۔ خالص ادبی کتابوں کی فروخت ان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ فی زمانہ نکشن کی مانگ ہے۔ اگرچہ مملو ماتی کتابوں کی اشاعت بھی بہت زیادہ ہے۔ ”گینز بک آف ریکارڈ“ کی ہر سال پانچ لاکھ سے زائد کاپیاں فروخت ہوتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آکسفورڈ ڈکشنری آج بھی بہت زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں شامل ہے اور ہر سال اس کی ادسٹاسات آٹھ لاکھ کاپیاں بک جاتی ہیں۔ ڈکشنری خریدنے والوں میں محض لاتبریری اور طلبہ ہی نہیں ہوتے، عام لوگ بھی ڈکشنری کے خریداروں میں شامل ہیں۔ اس کی مانگ ہمیشہ رہی ہے اور اس کی طباعت کا سلسلہ تمام سال جاری رہتا ہے۔

انگلستان میں کتابوں کی اشاعت کا کیا عالم ہے؟ اس کا اندازہ یوں لگائے کہ

سالگرہ کے موقع پر ان کے بارے میں بہت دلچسپ اور معلومات آفریں تفصیل علم میں آتی جو آپ کی اطلاع بلکہ عبرت کے لیے پیش کرنا ضروری ہے۔

باربرا کارٹ لینڈ پچھلی نصف صدی سے زائد عرصے سے انگریزی زبان کی معروف و مقبول ناول نگار ہیں۔ اس عرصے میں انھوں نے چار سو سے زیادہ کتابیں تحریر کی ہیں جو مغربی معیار سے بہت زیادہ ہیں۔ اس کے عوض ان کو ایولین پونڈ حاصل ہوتے جو ان کی آئندہ کئی نسلوں کی خوش حال زندگی کے لیے کافی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انگلستان میں وہ اور ستر زادی ڈیانا یکساں مشہور ہستیاں ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق آج تک ان کے تین ارب نوے کروڑ ناول فروخت ہو چکے ہیں۔ آمدنی کا اندازہ ایولین پونڈ ہے۔ باربرا کارٹ لینڈ نے رومانی ناولوں کے علاوہ اور بھی کئی قسم کی کتابیں لکھی ہیں مگر ان کی شہرت اور مقبولیت کی بنیادی وجہ مخصوص انداز کے رومانی ناول ہی ہیں۔ تمام تر شہرت اور دولت کے باوجود باربرا کارٹ لینڈ ایک تنہا اور اداس عورت ہیں۔ یوں تو چرچل، گاندھی، ماؤنٹ بیٹن سے لے کر اندرا گاندھی تک دنیا کی بہت بڑی بڑی ہستیاں ان کے حلقہ احباب میں شامل رہی ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ میں ان کے والد ہلاک ہو گئے تھے دوسری عالمگیر جنگ میں ان کے دونوں بھائی مارے گئے۔ دوسری عالمگیر جنگ ہی میں ان کے دوسرے شہر بھی زخمی ہو کر مر گئے اس کے بعد انھوں نے شادی نہیں کی۔ تنہا زندگی گزار رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ناول لکھنے کے لیے انھیں سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی مضامین اور کردار خود بخود ان کے دماغ میں آ جاتے ہیں۔ وہ تین سو تیس الفاظ فی گھنٹہ کی اوسط سے لکھواتی ہیں۔ ان کی عمر ۸۳ سال ہے مگر وہ چاق و چوبند ہیں اور کہتی ہیں کہ فی الحال میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

انگریزی کے ایک مصنف جیفری آرچر نے گزشتہ سال چار لاکھ ستر ہزار پونڈ کی

ہے جب کہ انگلستان کی کل آبادی بھی اتنی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قاری متعدد ناول پڑھتا ہے۔ لائبریریوں سے ہر سال ۸۸ لاکھ کے لگ بھگ قاری رومانی اور مقبول مصنفین کی کتابیں لے جاتے ہیں جب کہ اساتذہ کے قارئین کی تعداد ۵ لاکھ کے قریب ہے۔ انگلستان کے مقبول لکھنے والوں کی کتابیں سارے سال چھپتی رہتی ہیں۔

لکھنے والوں کی کمائی کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ تمام زندگی ان کا واسطہ صرف دو چیزوں سے رہتا ہے۔ ان کے ناشر سے یا پھر ان کے اکاؤنٹنٹ سے ایک مقبول ترین مصنف آٹھ لاکھ سے ۲۳ لاکھ پونڈ سالانہ تک کماتا ہے۔ فلموں ٹیلی ویژن اور جرائد سے وصول ہونے والی رقم اس کے علاوہ ہوتی ہے، یہ آمدنی محض انگلستان کے لیے ہے۔ غیر ملکی حقوق فروخت کرنے سے ایک مقبول مصنف کو اوسطاً ساڑھے سات لاکھ پونڈ سے ایک کروڑ پانچ لاکھ پونڈ تک حاصل ہو جاتے ہیں۔ فلم اور ٹی وی سے ہونے والی آمدنی بھی ۲۵ ہزار سے ڈھائی لاکھ پونڈ سالانہ تک ہو جاتی ہے۔ انگریزی مصنفین کی کتابیں امریکہ اور کینیڈا کے علاوہ جرمنی، فرانس، اسپین، میکسیکو، ہالینڈ، جاپان، اٹلی، جنوبی امریکہ، اسرائیل، ناروے، سویڈن، ڈنمارک اور فن لینڈ میں بھی فروخت ہوتی ہیں اور ان تمام ممالک کے حقوق کے عوض مصنف کو مقبول رقم حاصل ہوتی ہے۔

ان تمام اعداد و شمار کے باوجود بعض اوقات کوئی مصنف یک مُشت رقم لے کر بھی اپنی کتاب دے دیتا ہے۔ مثلاً ایک مصنف پیرک مونینگ اسمتھ نے ملکہ کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک کتاب لکھی جس کی قیمت ساڑھے بارہ پونڈ تھی۔ اس نے کتاب کا مسودہ صرف پانچ سو پونڈ کے عوض فروخت کر دیا۔ اگر وہ اس پر تین فیصد رائج بھی حاصل کرتا تو اب تک ڈیڑھ لاکھ پونڈ کماتا چکا ہوتا۔

۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک ہر سال تقریباً ۲۴۶۵ نئی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں لیکن گزشتہ سال مطبوعات کی تعداد ۳۸۹۸۰ ہو گئی۔ اب ان کی فروخت کا جائزہ لیجئے۔ ۱۹۸۳ء میں انگلستان میں ۷ ارب ۷ کروڑ پونڈ مالیت کی کتابیں فروخت ہوئیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

فلکشن اور کلاسیکی کتابیں = ایک ارب ۹ کروڑ پونڈ۔

اسکول کی ٹیکسٹ بکس = ایک ارب پندرہ کروڑ پونڈ

ٹیکنیکل اور سائنسی کتابیں = ایک ارب ۷ کروڑ پونڈ

بچوں کی کتابیں = ۶۳ کروڑ پونڈ

متفرق کتابیں = دو ارب، ایک کروڑ پونڈ

انگلستان میں ہر سال ایک ارب دو کروڑ پونڈ کے لگ بھگ مالیت کی "بائبل" بھی فروخت ہو جاتی ہے۔

رومانی ناول اور کہانیاں سب سے تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ ہر تین میں سے ایک عورت یہ کتابیں پڑھتی ہے ہر ماہ تقریباً بیس نئے رومانی ناول شائع ہوتے ہیں۔ رومانی ناول لکھنے والوں کی تعداد دوسو کے لگ بھگ ہے جن میں سے اکثر فلمی اور فرضی ناموں سے لکھتے ہیں۔ کئی حضرات زنانہ ناموں سے خواتین کے پسندیدہ رومانی ناول یا قاعدگی سے لکھتے ہیں اور ان کے ناظم خاصے مقبول بھی ہیں۔ حال ہی میں انگلستان میں لکھنے والوں کے مفاد میں ایک نئی اسکیم بھی شروع کی گئی ہے۔ اس کی رُو سے لائبریریوں سے کرائے پر دی جانے والی کتابوں پر بھی مصنف کو رائج دی جاتی ہے اور صرف اس ایک مد سے مصنف اوسطاً پانچ ہزار پونڈ سالانہ کمالیتا ہے۔ اس ایک مثال سے آپ انگلستان کے لکھنے والوں کی آمدنی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ رومانی مصنفین کے ناول پڑھنے والے قارئین کی تعداد آٹھ کروڑ پچاس لاکھ کے لگ بھگ

جب کبھی دنیا کو زیرِ دُزر کرنے کے منصوبوں سے فُرتِ متی تھی موصوف کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیتے تھے۔ سکندر اعظم کے بارے میں بھی بتایا گیا۔ سکندر نے ۳۲ سال کی عمر میں قریباً آدھی دُنیا فتح کر لی تھی۔ مگر عالم یہ تھا کہ ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں کتاب۔ سکندر، عالموں اور فلسفیوں کا جتنا مداح اور قدردان تھا وہ سب کو علم ہے۔ حکیم دیوجانس کلی سے ملاقات کے لیے ان کے پاس فاتحِ عالم خود چلا گیا۔ موصوف دھوپ سینک رہے تھے۔ سکندر کافی دیر کھڑا رہا مگر دیوجانس کلی نے سر اٹھا کر نہ دیکھا۔ آخر سکندر نے تنگ آ کر پوچھا:-

”میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیے؟“

جواب ملا:- ”ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔“

سکندر اور اس کے یگانہ روزگارِ اتالیقِ ارسطو کے واقعات تو اب تاریخ کا حصہ ہیں۔ ارسطو کی سکندر نے کتنی پاسداری اور عزت کی دہ سہی جانتے ہیں۔ ظاہر ہے جس کو علم کا شوق نہ ہو گا وہ عالموں کا قدردان کیسے ہو سکتا ہے؟

مصورِی کے بارے میں ایک اور کتاب میں سکندر کے ایک مصاحب کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ سکندر مصوروں کا شہسوار تھا۔ ایک بار اس نے اپنے عہد کے مشہور مصور اپلیس کو طلب کیا اور اپنی محبوبِ کینز کی تصویر بنانے کی فرمائش کی۔ مصور نے دلجمعی سے تصویر بنائی۔ بادشاہ نے تصویر دیکھی تو اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار پکار اٹھا۔

”بخدا اس لڑکی پر میرا کوئی حق نہیں رہا۔“

یہ کہا اور اپنی محبوبہ و لنوازِ مصور کو بخش دی۔

مصورِی اور مصوروں کے بارے میں ایک اور کتاب پچھلے دنوں شائع ہوئی ہے۔ دوسو تینتیس صفحات ضخامت کی اس کتاب کی قیمت پندرہ پونڈ ہے مصنف نے

انگلستان میں ہر ماہ بے شمار کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کا پڑھنا خود نقادوں کے لیے بھی مشکل ہے۔ کوئی کیا پڑھے اور کہاں تک پڑھے۔ اگرچہ تبصرے لکھنے والے بھی بہت سے ہیں اور انہیں کتابیں پڑھنے کے لیے مناسب وقت اور تبصرہ لکھنے کے لیے معقول معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ مگر کتابوں کی اشاعت جس رفتار سے ہوتی ہے اس کے پیشِ نظر ان کا مطالعہ کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ کتابیں ہر موضوع پر چھپتی ہیں اور یہ ہیں کہ ان کی موجودگی ہمارے دستور کے مطابق محض پریس ہی محسوس کرتا ہے۔ یہ قوم مطالعہ کی شائق ہے۔ ریسٹورانوں، ٹرینوں، بسوں، اسٹیشنوں، ایس اسٹاپوں پر ہر جگہ آپ لوگوں کو مطالعے میں غور پائیں گے۔ انتہا قریب ہے کہ آپ کوئی دلچسپ فلم دیکھنے گئے ہیں۔ مگر وقفے کے دوران بیشتر حاضرین کتاب یا اخبار سے شوق فرماتے نظر آئیں گے۔ تمام کتابوں کو پڑھنے کی بہت تو خود لندن والوں میں بھی نہیں ہے۔ پھر ہم تو مسافر تھے۔ ظاہر ہے اتنی سکت نہیں رکھتے تھے لیکن کتابوں پر تبصرے پڑھ کر تسلی کر لیا کرتے تھے۔ اس سرسری مطالعے کے دوران بعض دلچسپ معلومات بھی حاصل ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ زمانہ قدیم کے بیشتر جنگ جو فاتح مطالعے کے شوقین تھے۔

پنولین کے بارے میں یہ تحقیق کی گئی کہ اسے فتوحات کے سوا اگر کسی اور چیز سے دلچسپی تھی تو وہ تھی کتاب۔ موصوف ہر موضوع پر کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ مطالعے کا انداز یہ تھا کہ جو کتاب پسند نہ آتی وہ کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ جب کسی ہم پر جاتے تھے تو کتابوں کا انبار بھی ساتھ چلتا تھا۔ فُرتِ متی کے اوقات میں کتابوں کا مطالعہ جاری رہتا تھا۔ پنولین کو جب معزول کر کے سینٹ ہینن میں قید کیا گیا تو اس کی سب سے بڑی فرمائش کتابوں کے بارے میں تھی۔ چنانچہ اس قید خانے میں ایک بہت بڑا کتاب گھر بن گیا ہٹلر کے بارے میں بھی ایک صاحب نے یہ انکشاف کیا کہ ہٹلر کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔

یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جتنے بھی مشہور مصوّر گزرے ہیں ان کی عورتوں کی مصوّر اس بات کا نتیجہ نہ تھا کہ وہ عورتوں کے حسن و جمال کے معترف تھے۔ بلکہ ایک مصوّر گریٹر کے مطابق ”عورتوں کو یہ محض خوش فہمی ہی ہے کہ مرد اُن کے پرستار ہوتے ہیں۔ ان کو یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ مرد اُن سے کس قدر نفرت کرتے ہیں“

اس کتاب کے مصنف ایڈون ملینز کا کہنا ہے کہ دنیا کے مشہور مصوّروں نے جس قدر مہارت سے خراب عورتوں کی تصویر کشی کی ہے اتنی تو جہ عورتوں کی مصویت کو پینٹ کرنے پر نہیں دی۔ چنانچہ انھوں نے یہ پچوڑ نکالا کہ پکاسو نے عورت کا جس طرح حلیہ بگاڑا ہے اس کے پس پردہ مصوّر کی نفرت اور چھپی ہوئی نامکمل خواہش کا راز ہے۔ مصنف کے الفاظ میں محض چار مصوّر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے عورت کی تصویر کشی کے سلسلے میں نفرت اور خفارت کا ثبوت نہیں دیا۔ وہ کیرانٹ، گوگیا، تولوز اور داترو ہیں۔ ان کے سوا کسی نے بھی عورت کو احترام تقدس اور محبت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اپنے اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے مصنف نے بے شمار تصاویر کا حوالہ بھی دیا ہے۔



اردو مرکز اور استاد دامن

لندن میں ”اردو مرکز“ کی رونق افتخار عارف کے دم سے ہے۔ اردو کا کوئی بھی قابل ذکر (اور ناقابل ذکر) صاحب قلم ایسا نہیں ہے جو لندن کی فضاؤں سے پرواز کرنا ہوا گزر جائے اور افتخار عارف کے ہاتھ نہ آتے۔ ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی، امریکی، یورپی ملک کے اردو ادیب و شاعر جب انگلستان آتے ہیں تو افتخار عارف کو خبر ہو جاتی ہے اور وہ انھیں پکا ڈلی کے اردو مرکز میں کھینچ بلاتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں یہ شل مشہور تھی کہ فلاں شخص تو اتنا ہوشیار ہے کہ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتا ہے۔ افتخار عارف اُڑتے طیارے میں سفر کرنے والے مسافروں کو گن لیتے ہیں اور انھیں اردو مرکز کی ہوا کھلاتے بغیر واپس نہیں جانے دیتے۔

مئی کے آخری ہفتے میں ”اردو مرکز“ لندن میں ایک ایسی ہی تقریب منعقد ہوئی۔ اس بار یہ اردو کی نہیں بلکہ پنجابی زبان کے مایہ ناز شاعر استاد دامن کی یاد منانے کے لیے برپا کی گئی تھی۔

اس تقریب کی ایک خوبی تو اُد پر بیان ہو چکی ہے کہ ”اردو مرکز“ میں ایک پنجابی شاعر کو خراج تحسین ادا کیا جا رہا تھا۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ یہ ایک فری اسٹائل محفل تھی۔ جس کا جس زبان میں جی چاہے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ چنانچہ بیشتر حضرات نے استاد دامن کے بارے میں پنجابی زبان میں مضامین پڑھے اور خوب داد

نے پوچھا۔

”اُستاد یہ کیا؟“ کہنے لگے :

”پروفیسر صاحب! اس حجرے میں چوہے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ میری کتابیں کھائیں میں ان کی خوراک خود ہی انھیں پہنچا دیتا ہوں۔“

اُستاد نے پروفیسر صاحب سے فرمائش کی کہ وہ روسی زبان سیکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی ایسا شخص بتائیں جو روسی زبان بھی سکھادے اور سکھانے کے پیسے بھی وصول کرے۔ دوسری شہرط خاصی شکل تھی۔ کوئی شخص اُستاد دامن سے معاوضہ وصول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اور استاد مفت میں پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ کہتے تھے ”جو علم مفت حاصل ہو جاتے اس کی قدر نہیں ہوتی۔“

خیر۔ یہ تو جملہ مقررہ تھا۔ مختصر یہ کہ استاد روسی زبان نہ سیکھ سکے۔ مگر پروفیسر امین مغل ان کے مستقل ملاقاتی ضرور ہو گئے۔ دیکھا کہ ہر موضوع پر، ہر زبان کی کتابیں اس طرح رکھی ہوتی ہیں کہ مزید کی گنجائش نہیں ہے۔ کتابوں کی بُتات کا ایک سبب استاد دامن نے یہ بھی بتایا کہ کتاب رکھ کر بھول جاتا ہوں دوبارہ اس کتاب کی ضرورت پڑتی ہے تو اس انبار میں اسے تلاش کرنا محال ہے اس لیے بازار سے دوسری جلد خرید لانا ہوں۔

اُستاد دامن نے بڑی بے غرانی سے شعر لکھے اور بہت اچھے شعر لکھے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک عوامی شاعر تھے۔ ہر حکومت ان سے ناراض رہی اور وہ اس سے نالاں رہے۔ ایک بار ان کی شعلہ بیانی سے بگڑ کر پولیس حرکت میں آئی اور اُستاد دامن کو گرفتار کر لیا۔ الزام یہ تھا کہ ان کے حجرے سے بم برآمد ہوا ہے۔ اُستاد دامن نے عدالت میں کہا ”جناب عالی میرا حجرہ چھوٹا تھا درنہ پولیس تو

وصول کی۔ اُستاد دامن پاکستان کی مشہور ہستی تھے۔ ان کے بارے میں بھی قابل ذکر باتیں سب لوگ جانتے ہیں۔ بے نیاز، بے پردا، فقیر منش۔ ایک حجرے میں انھوں نے ساری زندگی گزار دی۔ نہ تنائش کی متانہ صلی کی پردا۔ یہ مصرعہ استاد دامن پر پورا صادق آتا تھا۔ جس شخص کو لباس کے معاملے میں محض ایک لنگی اور کرتہ درکار ہو۔ (جاڑے میں اس پر ایک موٹی چادر کا اضافہ ہو جاتا تھا۔) جسے شعر و شاعری اور کتب بینی کے سوا دُنیا کی کسی چیز سے سرکار نہ ہو، جو اپنی بات بے دھڑک کسی خوف و خطر کے بغیر کہہ دیتا ہو۔ نہ لالچ سے مجبور ہو نہ دباؤ میں آتا ہو۔ ایسے انسان کو ماڈرن درویش ہی کہا جاسکتا ہے۔ استاد، فیض احمد فیض کے بڑے مداح اور دوست تھے۔ ثبوت یہ کہ فیض صاحب نے وفات پائی تو اُستاد دامن بذاتِ خود انتہائی نگہداشت کے دارو میں تھے۔ لیکن اپنے دوست کو الوداع کہنے کے لیے بسترِ علالت سے اُٹھ کر ان کے گھر ماڈل ٹاؤن پہنچے اور انھیں سہرہ خاک کر کے واپس لگے۔ غالباً تیسرے ہی دن خود اُستاد دامن بھی انتقال فرما گئے۔

پروفیسر امین مغل نے ان کی وضع داری کا یہ واقعہ سنایا کہ ایک بار استاد کا فن آیا اور انھوں نے پروفیسر صاحب سے ملاقات کا وقت طلب کیا۔ پروفیسر صاحب نے کہا ”اُستاد کیوں شرمسار کرتے ہیں۔ حکم کیجئے۔ میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔“ کہنے لگے ”پروفیسر صاحب کام میرا ہے اس لیے مجھ کو چل کر آپ کے پاس آنا لازم ہے۔“ خاصی بحث و تمحیص کے بعد پروفیسر صاحب نے انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ پروفیسر صاحب کے پاس تشریف نہ لائیں۔ اب پروفیسر صاحب ان کے حجرے میں پہنچے۔ دیکھا کہ ایک چارپائی اور چائے بنانے کی چھوٹی تپائی کے سوا ہر جگہ کتابوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ فرش سے چھت تک کتابیں بھری ہوئی ہیں اور اُستاد دامن نان کے ٹکڑے توڑ توڑ کر ایک کونے میں ڈال رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب

وہاں سے ٹینک بھی برآمد کر سکتی تھی۔ اس واقعے کے بارے میں انھوں نے ایک شعر بھی موزوں کیا تھا جس کا مفہوم یہ تھا۔

نہ چرس نہ شراب نہ کوئی حسینہ نکلی
شاعر کے گھر سے نکلا بھی تو بم نکلا

استاد کو اپنے وطن اور اپنی زمین سے پیار تھا۔ شہر تو کیا وہ تو اپنا جڑہ تک ترک کرنے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔

لندن کے ”اردو مرکز“ میں استاد دامن کے بارے میں یہ دلچسپ محفل کافی دیر جاری رہی اور پس منظر میں ان کے دوست فیض احمد فیض کی تصویر لگی ہوئی تھی اور ان کے اشعار بھی لکھے ہوئے تھے۔ محفل کے اختتام پر چائے کا دور چلا میں سوچتا رہا کہ مرحوم فیض صاحب اور استاد دامن مرحوم میں کتنی بہت سی چیزیں مشترک تھیں۔ اب نہ دوسرا فیض پیدا ہوگا اور نہ دوسرا استاد دامن۔ تو پھر ہم نے ان کے ساتھ ان کی زندگی میں جو سلوک روا رکھا ہے اس کی تلافی کیوں کر ہوگی؟



لوکیشنز کی تلاش میں

ایک بار پھر پی آئی اے کی فلائٹ پی کے ۰۹، کراچی سے لندن روانگی کے لیے تیار تھی۔ فلائٹ کا وقت صبح آٹھ بجے تھا۔ مسافر دو تین گھنٹے پہلے ہی پہنچ گئے تھے اور ایئر لائن کے جھبیلوں سے فارغ ہونے کے بعد ڈیپارچر لائن میں موجود تھے۔ یہ لائن ایک لمبوتراسا ہال ہے بین الاقوامی معیار کے حساب سے دیکھیں تو نہایت بد نما اور بے حیثیت غالباً نیا لائن زیر تعمیر ہے اس سے پہلے ہم نے کراچی میں ایک اس سے بہتر لائن بھی دیکھا تھا جو غالباً ڈھے گیا۔ پاکستان کے بین الاقوامی ہوائی اڈوں کی حالت قابلِ تعریف نہیں ہے اب تو ہمارے حکام اور افسران بھی سال میں بیسیوں پھیرے مختلف ملکوں کے لگاتار ہیں۔ انھوں نے کبھی ہوائی اڈوں کا معیار دوسرے ملکوں کے ہم پلہ کرنے کے لیے سوچا گوارا نہیں کیا۔

فلائٹ پی کے ۰۹، کچھ کچ بھری ہوئی تھی ہم اور ہمارے ساتھی اپنی نشستوں پر براجمان تھے۔ جہاز نے پرواز کے لیے رن وے پر دوڑنا شروع کیا تو کمزور دل لوگوں کے چہرے فق ہو گئے لیکن پی آئی اے کے پائلٹ جس مہارت اور نفاست سے ہوائی جہاز اڑاتے ہیں اس کے پیش نظر بہت جلد مسافروں کے چہروں کی رونق واپس آگئی۔ جلدی اتر ہو سٹسوں نے ناشتے کی فراہمی شروع کر

یوں بھی پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں اور اظہار محبت کا ذرا سا موقع بھی ہاتھ سے نہیں گزاتے۔ پاکستانی بھی ترکوں کے عاشق ہیں اور ان کی محبت اور اخلاص پر فخر کرتے ہیں۔ غلوں اور محبت کے یہ مظاہرے مختصر قیام کے دوران میں بار بار نظر آتے۔

استنبول میں قیام خاصا طویل ہو گیا۔ وہاں جو مسافر اترے تھے اتنے ہی دوبارہ جہاز میں سوار ہو گئے۔ ہوائی جہاز پھر کچھ کچھ بھر گیا۔ اس بار جہاز کا عملہ بدل گیا تھا۔ استنبول میں عملے کا تبادلہ عمل میں آیا اور چند ہی لمحے بعد مسافروں کی خدمت میں کھانا پیش کیا جانے لگا، ہم نے دنیا کی اور بھی اتر لائینز پر سفر کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کھانا پلانے کے معاملے میں جس قدر شیرینی آتی اے دالے ہیں، دوسرے اس کے عشر عشر بھی نہیں اور پھر کھانا بھی بہت لذیذ اور عمدہ ہوتا ہے چنانچہ مسافروں کو استنبول میں انتظار کی جو زحمت اٹھانی پڑی تھی اس کا مداد دیا۔ ”پیا“ بنے کھانے سے کرو یا پی آتی اے کی فلاٹ بھی بہت اچھی ہے کھانا بھی بہت لذیذ ہوتا ہے، ہمیں ذاتی طور پر اگر کسی چیز پر اعتراض ہے تو وہ ہسٹس خواتین کے اعلانات پر ہے۔ انگریزی کی حد تک تو معاملہ ٹھیک ہے لیکن اردو میں اعلانات جس طرح زبان کو توڑ موڑ کر کیے جاتے ہیں ان کا سبب آج تک سمجھ میں نہیں آیا اور پھر لہجہ بھی ایسا جیسے کوئی فرینچ خاتون اردو بولنے کی کوشش کر رہی ہوں، نہ اسے آپ اردو کہہ سکتے ہیں نہ انگریزی، سخت کوفت ہوتی ہے۔ یہ کسی ایک فلاٹ تک محدود نہیں ہے پی آتی اے کی تمام اناؤنسز نے یہی لب و لہجہ اپنا لیا ہے۔ جس طرح ٹی وی کے اداکاروں اور اناؤنسروں کا ایک مخصوص لب و لہجہ ہے اسی طرح پی آتی اے کی اناؤنسز کا بھی ایک علیحدہ انداز بیان ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی صاحب انہیں یہ کیوں نہیں سمجھاتے کہ دوسری زبانوں کی طرح اردو

دی۔ مسافروں نے کھانا پینا شروع کر دیا اور کچھ دیر کے بعد سب کا اعتماد بحال ہو گیا۔ ایک پاکستانی فلم ”ہم اور تم“ کا یونٹ اس فلاٹ میں سفر کر رہا تھا یہ اس یونٹ کی پہلی قسط تھی۔ باقی لوگ اور اداکار بعد کی قسطوں میں آنے والے تھے ہدایت کار حسن عسکری اپنی بیگم کے ساتھ مصروف سفر تھے۔ فلم والوں کی مصروف زندگی انہیں عام طور پر گھریلو زندگی سے دور رکھتی ہے لیکن اس سفر میں حسن عسکری اور ان کی بیگم نے جتنا وقت ایک ساتھ گزارا غالباً کچھ چند مہینوں میں بھی اتنا رفاقت کا لطف نہ اٹھایا ہو گا۔ حسن عسکری صاحب کے کوٹ کا بٹن ٹوٹ گیا تھا اور ان کی بیگم بٹن ٹانگ رہی تھی۔ یہ گھریلو سبب جو ہوائی جہاز میں رونما ہو رہا تھا بہت دلچسپ تھا۔ ہم نے عسکری صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو بولے :

”یہ بٹن مجھے کم سے کم پچاس ہزار میں پڑے گا“

ان کا اشارہ بیگم کی ہمارے ہی کے اخراجات کی طرف تھا۔ سیلائی کے معاملے اتنے زیادہ تو دنیا میں کہیں بھی نہ ہوں گے۔

ہوائی جہاز کی پہلی منزل استنبول تھی۔ یہاں مسافروں نے لاونج میں اتر کر کھانا پیرسیدھے کئے گھومے پھرے اور کچھ خریداری بھی کی۔ مسافروں کی یہ عجیب نفسیات ہے کہ وہ ہر اتر پورٹ کی ٹیکس فری دکانوں سے کچھ نہ کچھ خریدنا چاہتے ہیں حالانکہ ابھی آغاز سفر ہوا ہے اور آگے چل کر انہیں دنیا کے بے شمار شہر اور دکانیں دکھنی ہیں، مگر ان کی خریداری اور دل لہانے کا سلسلہ پہلی منزل ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ استنبول کا اتر پورٹ دُنیا کے جدید ترین ہوائی اڈوں کا ہم پلہ ہے (کراچی سے مقابلہ نہ کریں۔ شرمندگی ہوتی ہے) کراچی میں گرمی تھی لیکن استنبول میں ٹھنڈی ہوا دل نے خیر مقدم کیا، لیجئے احساس ہو گیا کہ اب ہم ایشیا سے یورپ کی طرف سفر کر رہے ہیں سمارٹ عورتیں اور مرد دکانوں اور اتر پورٹ کے مختلف شیڈوں میں مامور تھے ترک

ٹھنڈی اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور آسمان پر گہرے بادل تھے مگر چھوڑیے ان باتوں کو پہلا مرحلہ تو امیگریشن کا تھا، مجھے لندن آتے جاتے ہوتے کئی سال گزر گئے ہیں اب تو امیگریشن والے یہ بھی سوال نہیں کرتے کہ کتنے عرصے ٹھہرنے کا ارادہ ہے یا آپ کے پاس پیسے بھی موجود ہیں یا نہیں! البتہ فلم یونٹ کے بعض حضرات ایسے تھے جو نہ صرف پہلے بار لندن آتے تھے بلکہ ان کے پاسپورٹ بھی "تازہ دم" تھے یعنی ایک تو نوجوان اور صحت مند آدمی اس پر لندن پر پہلا حملہ اور پھر پاسپورٹ بھی نیا نکور۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ بعض حضرات اپنی قومی زبان کے علاوہ دوسری کوئی زبان نہیں بول سکتے تھے۔ ہم نے امیگریشن والوں کو یہ مسئلہ سمجھانے کی کوشش کی لندن میں رواج یہ ہے کہ مسافر باری باری ایک وقت میں صرف ایک (ایک ہی خاندان کی صورت میں تمام خاندان) امیگریشن کی میز کے سامنے پہنچتا ہے۔ ہمارے ہتھے میں جو صاحب آتے وہ نوجوان اور خوش مزاج تھے، بارش بھی تھی۔ ہم انھوں نے جھٹ پٹ فارغ کر دیا اور پھر جب ہم نے انھیں دوسرے ساتھیوں کی مشکل کے بارے میں بتایا تو انھوں نے دوسری میزوں پر بھی جا کر انھیں صورت حال سے مطلع کرنے کی کوشش کی۔

لندن اترپورٹ پر اب یہ آسانی (یا پریشانی) متیا کر دی گئی ہے کہ ایشیائی مسافروں کا انٹر ویو ان کی زبان میں ہوتا ہے۔ چنانچہ پنجابیوں سے ٹھیٹھ پنجابی میں سوالات کیے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے پنجابی خواتین و حضرات کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ ہمیں تو امیگریشن کی سرحد عبور کرادی گئی مگر دوسرے حضرات سے سوالات شروع ہو گئے۔ بد قسمتی سے بعض حضرات کے جوابات ایک دوسرے سے قدرے مختلف تھے مگر ہم نے یہ دیکھا کہ انگریز بہت معاملہ فہم اور قیافہ شناس قوم ہے۔ تمام تر غلطیوں کے باوجود امیگریشن والوں کو یہ احساس تھا کہ یہ لوگ واقعی فلم یونٹ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ

کا بھی ایک مخصوص انداز ہے۔ گوروں کے انداز میں اعلانات کر کے ہماری اناؤنسز آخر ظاہر کیا کرنا چاہتی ہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ جب یہ خاتون (کوئی بھی خاتون) کوئی اعلان کرتی ہیں تو لب و لہجے کو مسخ کرنے کے ساتھ ساتھ ادائیگی کا ایسا انداز اختیار کرتی ہے جیسے کوئی رومانی گفتگو فرما رہی ہوں۔

بہر حال استنبول سے ایسٹرڈیم تک کی پرواز پھر بہت خوب تھی۔ ایسٹرڈیم پر مختصر قیام کے بعد اب جو طیارہ روانہ ہوا تو ایک خاص بات یہ ہوئی کہ وہ انگریز مسافر جو استنبول تک نہایت شرافت اور مقبولیت کے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے اچانک "رواں" ہو گئے۔ انھوں نے زور زور سے ہتھ بند کرنے شروع کر دیے اور پھر بلند آوازوں سے گانے بھی گاتے، پتہ چلا کہ استنبول میں ان کے ہاتھ "دخت رز" آگئی تھی بوقت ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ آپس میں باری باری بول کو منہ لگاتے اور دوسرے مسافروں کا سکون برباد کرتے رہے۔ پی آئی اے کی فلائیٹ پر شراب کی بندش ہے۔ بے زبان مسافر بار بار پی آئی اے کے عملے کی طرف دیکھ رہے تھے جو اپنے بد ہنسیب مسافروں کی حرکتوں کو نہایت خوش دلی سے نظر انداز کرتے رہے۔ ہم لوگوں کو اپنے "گانے ماجھوں" کی حرکتوں پر بہت مذمت ہوتی ہے لیکن یقین کیجئے کہ استنبول سے لندن تک جو بد تیزیاں یہ منڈب انگریز کرتے رہے کاش انگریزوں کا سر بھی اس پر شرم سے جھک جائے مگر ایسا ذرا ہونا مشکل ہے اس لیے کہ دوسری قویں اتنی جلدی نادم ہو کر سر جھکانے کی عادی نہیں ہیں جتنے کہ ہم ہیں۔

ایسٹرڈیم میں سردی نے زیادہ رنگ دکھایا بارش بھی ہو رہی تھی اور ٹھنڈی ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ اترپورٹ لائن میں بیڑ چل رہے تھے جس سے اندازہ ہو گیا کہ لندن کا موسم کیسا ہوگا۔

لندن کا اترپورٹ حسب معمول جانا بوجھا اور مانوس نظر آیا، سردی خاصی تھی،

ہیں کہ ہمارے ملک میں جو ٹریفک کے قواعد ہیں وہ یہی انگریز بنا کر گئے ہیں۔ سڑکوں پر روڈ سائن دہی، سوائے اس کے کہ ان پر عمل درآمد ذرا سختی سے کرایا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر قدم پر ہندوستانی پاکستانی چہرے نظر آ جاتے ہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ لندن میں کوئی جگہ، کوئی دکان، کوئی سڑک ایسی نہیں ہے جہاں اردو اور ہندوستانی یا پنجابی زبان سُنانی نہ دے۔ بعض علاقوں پر تو اپنے ملک کا گمان گزرتا ہے اب بتائیے جہاں اتنی ”غریباں“ ہوں تو وہ شہر آپ کے دل میں کیوں نہ اُتر جلتے؟

لندن ان دنوں بہت ٹھنڈا ہے یہاں کے موسم کا یوں تو کبھی بھی اعتبار نہیں ہوتا مگر ان دنوں یہ غیر مستقل مزاجی ذرا زیادہ ہے۔ گھڑی میں دھوپ چمک رہی ہے، گھڑی میں گہرے بادل، ٹھنڈی ہوائیں اور بارش، اس موسم سرما میں انگلستان میں خوب سردی پڑی ہے۔ لندن میں سالہا سال کے بعد برف باری ہوئی۔ اپریل کے وسط میں عام طور پر انگلستان میں موسم بہار کی آمد ہو جاتی ہے لیکن اس بار سردیاں زیادہ لمبی ہو گئی ہیں۔ درخت سوکھے، ٹنڈ ٹنڈ، گھاس میں وہ بات نہیں جو موسم بہار کی آمد پر ہو جاتی ہے۔ یہاں وہاں پھول البتہ نظر آ جاتے ہیں۔ مگر بہت کم، گویا جس بہار کی امید لے کر لندن آئے تھے وہ ابھی دُور ہے۔ لندن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ چاہے جتنے عرصے بعد لندن آئیں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوگی۔ یوں لگے گا جیسے ابھی آپ یہاں سے گئے تھے۔ وہی سڑکیں، وہی بازار، وہی عمارتیں، قدامت پسندی تو اس قوم کا طرہ امتیاز ہے نا۔ اور روایت پسندی میں اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔

جس فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں ہم یہاں آئے ہیں اس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مناسب اور موزوں مقامات شوٹنگ کے لیے تلاش کیے جائیں۔ لندن شہر سے زیادہ دوسرے مقامات کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مناسب لوکیشنز کی تلاش کا آغاز ہو گیا۔

انگلستان کے شمالی علاقے میں ”ایک ڈسٹرکٹ“ واقع ہے۔ یہ علاقہ سکاٹ لینڈ

کچھ دیر کی رد و قدح کے بعد یہ مرحلہ بھی آسان ہو گیا۔ اس اثنا میں ہم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو چند اور لوگ بھی مبتلائے پریشانی نظر آئے مثلاً ایک صاحب جو کسی برطانوی خاتون کے منگتر تھے پاکستان سے آئے تھے اور ان سے ایک انگریز جرح کر رہا تھا۔ جتنی اس زمانے میں کوئی دولہا یا دولہن شرم خاک کرے گا جب اس سے ایسے ایسے بے شرمی کے سوالات کیے جاتیں گے۔ ہم اتر پورٹ سے چلے آئے پتہ نہیں بعد میں ان منگتر صاحب پر کیا گزری؟

لندن عجیب و غریب شہر ہے۔ کلاسیکی راگ کی طرح یہ رفتہ رفتہ آپ پر اثر کرتا ہے اور پھر سارے وجود میں رچ بس جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جس طرح لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ”ہورا، ہورا“ اسی طرح لوگ کہتے ہیں کہ صاحب لندن کی کیا بات ہے؟ جس کسی کو ایک بار لندن کی رنگینیاں اور رعنائیاں بھا جاتیں پھر وہ اس شہر کے سحر کا اسیر ہو جاتا ہے۔ یوں تو دنیا میں اور بھی بڑے بڑے اور خوبصورت شہر ہیں۔ پیرس جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر شخص کے دردِ وطن ہیں ایک اس کا اپنا وطن اور دوسرا پیرس۔ خوب صورتی اور دلکشی میں بھی یہ شہر بے مثال ہے۔ اس کی رنگینیاں اور دلفنیاں اپنی جگہ مگر لندن میں دنوں کو موہ لینے والی جو بات ہے وہ پیرس میں کہاں ہے؟ شاید ایک دگر لندن کا ماحول اور زبان بھی ہے۔ یورپ کے شہر میں ہم خود کو اجنبی اور بے زبان محسوس کرتے ہیں زبانِ جدا۔ دکانوں کے بورڈ ناقابلِ فہم، سڑکوں کے نام مشکل، راستوں کے نشانات اور ہدایات مختلف لوگوں کی شکیں اور عادتیں نامانوس، بھلا ایسے شہر میں کوئی اپنے آپ کو مسافر اور اجنبی محسوس نہ کرے تو کیوں نہ کرے؟ جب کہ لندن میں سڑکیں جانی بوجھی لگتی ہیں۔ برصغیر کے عام بڑے شہروں کو انگریزوں نے اسی طرز پر تعمیر کیا تھا پھر سڑکوں کے نام جانے بوجھے۔ انگریزی زبان تو خیر ہے ہی ہماری اپنی زبان خود اپنے ملک میں ہم اسی زبان کا سہارا لیتے ہیں، یہ تو آپ جانتے

کے کمریوں اور معیار کی نگرانی کے لیے کوئی ادارہ ہی موجود نہیں ہے یا اگر کوئی ادارہ ہے بھی تو اس سے تعلق رکھنے والے حضرات کو شاید یہ علم ہی نہیں ہے کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی ہوٹل ہوتے ہیں اور کیسے ہوتے ہیں؟ ورنہ سب سے معیاری اور گمرانی کیوں ہوتی؟

ہم ونڈر میٹر کے جس ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے یہ جھیل کے سامنے ہے منظر نہایت خوش نما، جس کمرے میں ہم مقیم تھے اس کی کھڑکی سے جھیل کا ناقابل فراموش منظر نظر آ رہا تھا، کمرے میں پوسٹر بیڈ تھا۔ فرنیچر نہایت اعلیٰ درجے کا ٹی وی اور ٹیبلن اسٹری کرنے کا اہتمام کمرے میں موجود اور غسل خانہ؟ غسل خانہ اتنا وسیع اور خوبصورت کہ کیا بتائیں۔ اچھے خالص کمرے کے ساتھ غسل خانہ تھا جس میں ایک حوض مناسبت، اس ٹب میں ہم جیسے انارڈی پیرا کی بھی کر سکتے ہیں بلکہ انارڈی پن کی دھب سے ڈوب بھی سکتے ہیں۔ اس کمرے کا کرایہ سن کر آپ حیران رہ جائیں گے۔ اس لیے ہم آپ کو حیران نہیں کرنا چاہتے اور اس کمرے میں صبح کا ناشتہ بھی شامل تھا اور ناشتہ بھی مکمل انگریزی، نانٹہ جو ہم جیسے کم خوروں کے دو وقت کے کھانوں کے برابر ہوتا ہے۔

نہایت لمبا سفر کر کے اور بے شمار جھیلیں اور مناظر دیکھنے کے بعد ہم اس ہوٹل میں داخل ہوتے توجی خوش ہو گیا۔ نہ صرف آتش دیکھ کر بلکہ ہال میں ایک طرف آتشان میں لکڑیوں کی آگ روشن دیکھی سارا ہال اس کی تمازت سے خوشگوار ہو گیا تھا ہماری سمجھ میں یہ بات آج تک نہیں آتی کہ یہاں کی ہمت ٹیکن منگانی کے باوجود اتنے شاندار ہوٹل اور بہترین خدمات فراہم کرنے کے بعد اتنے کم کرائے وصول کر کے یہ لوگ کیوں کر زندہ رہتے ہیں؟ اور ان ہوٹلوں کا عملہ اس قدر خوش مزاج اور مہمان نواز کیوں کر ہوتا ہے؟ شاید موسم کا اثر ہے! رات کو کھانے کے لیے ایک در ہوٹل میں گئے۔ یہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ شاندار، ڈاننگ ہال میں ہمارے لیے

کے نزدیک ہے اور اپنی خوب صورتی کے اعتبار سے قابل دید۔ وہ تو آپ نے سنا ہو گا کہ کشمیر کے بارے میں منگل بادشاہ نے کہا کہ اگر دنیا میں کہیں جنت ہے تو یہی ہے مگر دنیا کے اور بھی بہت سے علاقوں میں اللہ تعالیٰ نے جنت کے نمونے بنا رکھے ہیں۔ انگلستان کا ایک ڈسٹرکٹ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ یہاں چھوٹی بڑی بہت سی جھیلیں ہیں، خوش نما مناظر اور سبزہ زار ہیں، کھیت ہیں، باغات اور جنگلات ہیں۔ ایک تو قدرت نے فیاضی سے کام لیا ہے۔ اس پر انسانوں کی ہنرمندی نے مزید چاند لگا دیتے ہیں۔ جگہ جگہ پرانے لارڈز کے قلعے اور محلات ہیں جن میں سے بیشتر اب سیاحوں اور عوام کے دیکھنے کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ ہم نے بھی ایسے لارڈز کے بارے میں بہت سنا اور پڑھا تھا مگر اس بار بالمشافہ دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا۔

بذریعہ کار لندن سے روانہ ہوتے تو پہلی منزل "بلیک پول" تھی یہ ساحلی شہر ہے اور اتنا ہی دلکش اور دل فریب ہے جتنے کہ یورپ کے ساحلی شہر ہوا کرتے ہیں۔ ان دنوں سردی زیادہ ہے اور سیاحوں کا موسم بھی شروع نہیں ہوا اس لیے بلیک پول میں وہ رونق نظر نہیں آتی جو چند ہفتے بعد ہو جائے گی۔ ایک تو سردی اور پورے پنج بتر ہوائیں اتنی تیز کہ کھڑا ہونا دشوار، ہمیں کسی نے پاکستان میں یہ غلط خبر سنائی تھی کہ لندن میں موسم گرما شروع ہو چکا ہے۔ مگر یہاں تو انگریز گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے سردی سے سٹکڑے پھر رہے ہیں تو پھر بھلا ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔

ونڈر میٹر جھیل ایک ڈسٹرکٹ کی بہت خوبصورت اور خاصی طویل جھیل ہے۔ اسی نام کا شہر بھی ہے۔ مختصر لیکن بہت خوبصورت، ہوٹلوں کی بہتات ہے اور ہوٹل ہمارے پاکستانی حساب سے نہایت اچھے اور نسبتاً کافی ارزاق۔ خیر یہ تو ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں ہوٹل غالباً ساری دنیا کے ہوٹلوں سے زیادہ منگے ہیں۔ کیا یورپ کیا امریکہ کیا ایشیاء اور کیا مشرق بعید، یوں لگتا ہے جیسے ہمارے ملک میں ہوٹلوں

ابر آلودہ آسمان اور سرد تیز ہواؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ مزید ستم یہ ہے کچھ دیر بعد بارش بھی شروع ہو گئی پہلے ایک قریبی جزیرے میں جلنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ جزیرہ جسے یل آئی لینڈ کہا جاتا ہے ایک لارڈ کی ملکیت ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں جانے کے لیے بوٹ کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ موجود نہیں ہے۔

جادید ملک صاحب نے ایک دن پہلے جاتیاد کے میجر سے فون کے ذریعہ ملاقات کا وقت لے لیا تھا اور انہوں نے ساڑھے دس بجے موٹر بوٹ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہم دس بجے جھیل پر پہنچ گئے ایک طرف ونڈر میٹر کا خوبصورت قصبہ اور اونچی نیچی پہاڑیوں پر بنے ہوئے خوش نما ہوٹلوں اور مکانوں کی سفید عمارتیں چمک رہی تھیں دوسری طرف جزیرے کا منظر تھا۔ سبزے اور درختوں کی آمیزش کچھ عجیب ہی سماں پیدا کر رہی تھیں، اس جزیرے میں لارڈ کے محل کے علاوہ اور کوئی عمارت موجود نہیں ہے۔ اس محل کی خوبی یہ ہے کہ یہ گولائی میں تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ انگلستان کی تاریخ کا پہلا گول محل ہے جو سولہ سو عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا اس اعتبار سے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے ہم لوگ رئیس جادید ملک اور ہدایت کار عسکری صاحب اور ان کی بیگم جھیل کے پٹن پر کھڑے موٹر بوٹ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ کوئی دوسری کشتی ہمیں اس جزیرے میں نہیں لے جاسکتی تھی یہ کیونکہ ذاتی رہائش گاہ ہے اس لیے اجازت کے بغیر کوئی اس جزیرے پر قدم نہیں رکھ سکتا۔ ساڑھے دس بجنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ جزیرے کی طرف سے ایک مختصر موٹر بوٹ نمودار ہوئی۔ جادید ملک نے مطلع کیا کہ یقیناً یکشتی ہمیں لینے کے لیے بھیجی گئی ہے۔ موٹر بوٹ کنارے سے آکر لگی اور اس میں سے ایک لڑکا بھگتا ہوا باہر نکلا۔ ان صاحب نے ایک فضل سی گرم برساتی اور جینز پہن رکھی تھی ہمیں دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ ہم ہی ان کے منتظر ہیں۔ موٹر بوٹ پانی میں بھگی ہوئی تھی۔ ککڑی کی نشستیں پانی سے شرابور تھیں۔ اس لیے مجبوراً انہی پر بیٹھا پڑا اور

میز مخصوص تھی۔ کھانے کی قیمت چھ پونڈ فی عدد اور کھانا بھی تین کورس کا مکمل ڈیزر سوپ، سوپ اور کافی سمیت۔ اتنے شاندار ہوٹل میں اتنے متواضع عملے کی خدمات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اتنا اچھا اور اتنا سستا کھانا بھلا کہاں دستیاب ہو گا اور یہ حال اس وقت جب انگریز گرائی کے مارے "ہائے مرگئے ہائے مرگئے" چلا رہے ہیں۔

لیک ڈسٹرکٹ انکا شار کے علاقے میں واقع ہے۔ شمالی انگلستان کا یہ خطہ جنتِ نظیر کہا جاسکتا ہے۔ قدرت نے خوب صورتی اور دلکشی نہایت فیاضی کے ساتھ عطا کی ہے۔ سبزہ زار، جھیلیں، خوب صورت مناظر، کہیں کہیں حد نظر تک تناور درختوں کے ذخیرے ابھی موسم نے پوری طرح دامن نہیں سمیٹا اور یہ علاقے تو یوں بھی انگلستان کے سرد ترین علاقے سمجھے جاتے ہیں۔ اس بار یہاں سردی معمول سے زیادہ پڑی اور خزاں کا موسم کچھ زیادہ طویل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میدانوں میں تو سبزے نے ڈیرے جمالیے لیکن درختوں کے جسم ابھی تک پتوں سے محروم ہیں۔ خشک ٹنڈو درختوں کا اپنا حسن ہوتا ہے، بلکہ بادلوں اور دھند کے ساتھ پتوں سے محروم کچھ زیادہ ہی بھلے لگتے ہیں۔ انگریزوں کو یہ موسم اور سماں شاید ناگوار گزر رہا ہو گا لیکن ہم جیسے نووارد سیاحوں کے نزدیک یہ موسم اور منظر عجیب دلکشی کا حامل ہے۔ موسم کا یہ عالم کہ دھوپ کبھی کبھی چمکتی ہے مگر زیادہ تر ابر چھایا رہتا ہے۔ کبھی گہرے بادل آجاتے ہیں اور پھوار پڑنے لگتی ہے اور کبھی دھواں دھار بارش۔ ہم کیونکہ مناسب گرم کپڑے ساتھ نہیں لاتے تھے اس لیے سردی اور بارش کی شدت ہمیں پریشان کرتی رہی۔ ایسے ٹنڈے اور نم موسم میں بھلا ایک معمولی سوٹ کس کام آسکتا ہے؟

آج اس پاس کے شاہی محلات اور باغات دیکھنے کا پروگرام تھا لیکن جب ہوٹل سے باہر نکلے تو پتہ چلا کہ دھوپ اپنا مختصر سا حیلہ دکھا کر غائب ہو چکی ہے

مرے ہوتے بھی سالہا سال گزر چکے ہیں مگر ”گتے“ سے خبردار رہتے“ کا بورڈ انھوں نے اپنے گھروں میں لگایا ہوا ہے اور بہت سے لوگ محض بورڈ پڑھ کر ہی کئی کاٹ جاتے ہیں اور گھر کی چار دیواری میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ بیگم عسکری نے کچھ ہمت بڑھائی اور ہم سب نے محل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ مگر کچھ فاصلے پر عسکری صاحب کو پھر گتے سے خبردار رہنے کا بورڈ نظر آیا تو ان کا قدم زمین پر جم کر رہ گیا۔ اس بار انھوں نے ہم سب کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرائی کہ گتے سے خبردار رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ جاوید ملک صاحب کا کہنا تھا کہ انگریزوں کے گتے نہایت مذہب اور بااخلاق ہوتے ہیں ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر عسکری صاحب اور ان کی بیگم کا خیال تھا کہ گتا تو بس گتا ہوتا ہے۔ انگریزی اور دیسی سے کوئی فرق نہیں پڑتا چنانچہ عسکری صاحب اور ان کی بیگم نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

ہم گوگو کے عالم میں تھے، کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی رُک جاتے تھے مگر جاوید صاحب ہم لوگوں کی بزدلی پر ہنستے ہوئے محل کی طرف رداں رداں تھے۔ اسی وقت محل کی گولی عمارت سے ایک صاحب سوٹ اور کوٹ پہنے ہوئے برآمد ہوئے یہ اس جاگیر کے مینیجر تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر جاوید صاحب سے ہاتھ ملایا انھیں نمودار ہوتے ہوئے دیکھا تو عسکری صاحب بھی بمع بیگم کے آگے آئے تعارف کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسٹر براؤن نے ہمارے عجیب و غریب محلے کو بغور دیکھا اور پھر عسکری صاحب کی بیگم پر نظر ڈالی جو شلوار قمیض میں ملبوس تھیں۔ اوپر سے انھوں نے گرم سیاہ شال پیٹی ہوئی تھی جو تیز ہوا کی وجہ سے سلہانی دشوار تھی۔ تعارف کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ محل کی طرف سے دو گتے نمودار ہوئے۔ ایک کافی بلند و بالا اور نہایت خطرناک شکل کا تھا اور دوسرا مختصر سا، ہم لوگوں کی توجہ ان نکل گئی مگر مسٹر براؤن کی موجودگی غنیمت

کشتی بان نے کشتی کا رخ جزیرے کی طرف موڑ دیا۔ عسکری صاحب ہمیں ارد گرد کے مناظر کی خوبصورتی کی طرف متوجہ کرتے رہے مگر سردی اور جھیل میں پانی کی اٹھتی ہوئی موجوں کی وجہ سے ہماری جان پر مبنی ہوتی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ ہم تیرنا نہیں جانتے اس لیے کمرے پانی سے ڈرتے ہیں۔ عسکری صاحب ہیں تسلی دینے کے لیے بولے ”فکر نہ کیجئے۔ ہم چاروں میں سے تیرنا کوئی نہیں جانتا اور اگر جانتے بھی ہوتے تو کیا فرق پڑتا۔ جھیل کے تیج بستہ پانی میں کتنی دیر تیر لیتے؟ بات معقول تھی اس لیے ہم دل پر جبر کر کے بیٹھ رہے کشتی بان سے ہم لوگ مختصر سفر کے دوران جزیرے کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ ہم سب اس کو ملازم سمجھ رہے تھے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اس پھٹیچر محلے میں یہ صاحب دراصل لارڈ کے صاحبزادے ہیں۔ بہت حیرت ہوئی ہمارے ملک میں تو معمولی لوگوں کے بیٹے بھی اس ”محلے“ میں رہتا اور ایسے گھرے پڑے کام کرنا پسند نہیں کرتے۔

جزیرے پر پہنچ کر فرزند لارڈ نے موٹر بوٹ روک دی اور ہم لوگ چھلانگیں لگا کر کشتی سے باہر نکلے اور جزیرے پر قدم رنجہ فرمایا کشتی بان ہمیں چھوڑ کر رخصت ہو گئے اور ہم لوگوں نے جزیرے کی خوش نمائی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گول قصر کی طرف قدم بڑھائے، چند قدم چلے تو سامنے ایک درخت پر نمایاں عبادت نظر آتی ”گتوں سے ہوشیار رہتے“ اب حقیقت یہ ہے کہ ہم سب ہی گتوں سے ڈرتے ہیں محاورے کے مطابق جو گتے بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں ہیں مگر بقول مرحوم پطرس بخاری کون جانے کہ یہ گنگاب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔ عسکری صاحب اور ان کی بیگم تو وہیں رُک گئے مگر ہم نے دلاسہ دیا کہ بھائی محض ڈرانے کے لیے یہ بورڈ لگا دیا ہوگا۔ بعض لوگ نفسیاتی طور پر رعب ڈانے کے لیے گتوں سے خبردار کرنے کا بورڈ لگا دیتے ہیں۔ ہم پاکستان میں بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں جن کے گتوں کو

تھی۔ کتوں نے ہمارے نزدیک آکر مہانوں کو گھورا اور پھر خوشحال شکل والا کتا آگے بڑھ کر غالباً ہم سب سے مزید تعارف ہونے کی غرض سے ہمیں سونگھنے لگا۔ ہماری تو جان ہی نکلی جا رہی تھی مگر عسکری صاحب کی پیگم کی توجیح بھی نکل گئی۔ کتے کو یہ آواز پسند نہیں آئی اور اس نے غصے سے غڑانا شروع کر دیا۔ کبھی وہ ہماری طرف آتا اور ہمیں چپکھنے کی کوشش کرتا اور کبھی جاوید صاحب کو سونگھنے لگتا، خوف کے مارے ہم سب کا بڑا حال تھا۔ مسٹر براؤن کی حرکت ملاحظہ فرمائیے کہ بجائے کتے کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے وہی زبان میں ہمیں مشورہ دینے لگے ”حرکت مت کیجئے خاموش کھڑے رہتیے۔ بالکل مت ڈریئے“ خیر حرکت تو ہم ویسے بھی نہیں کر رہے تھے۔ سب کے سب بت بن کر رہ گئے تھے۔ اب کتے نے غڑانے کے ساتھ ساتھ دانت بھی نکالنے شروع کر دیئے اور اس کی شر پر چھوٹا کتا بھی اُچھل کود کرنے لگا۔ مسٹر براؤن کے دل میں اللہ نے نیکی ڈالی اور انھوں نے کتے کا پٹہ تمام کر نہایت نرمی سے اپنے ساتھ آنے کی ہدایت کی، وہ چلا تو گیا مگر مسٹر کریمیں گھورتا اور خفا ہوتا رہا۔ چھوٹا کتا ابھی تک وہیں کھڑا جمنا شک کر رہا تھا مگر ہم سب کی توجہ بڑے کتے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد مسٹر براؤن نے اس کو کہیں لے جا کر باندھ دیا اور مسکراتے ہوئے واپس آئے ہم نے چھوٹے کتے کی طرف اشارہ کیا تو بڑے اڑے اس سے کیا ڈرنا۔ یہ تو بڑی کے برابر ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے فوراً اپنی گود میں اٹھالیا۔ کتے کے خوف سے نجات ملی تو ہم سب کی جان میں جان آئی اور ہم نے مسٹر براؤن کی سرکردگی میں محل کی عمارت کا رخ کیا، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس وقت لیڈی صاحبہ کچھ مہانوں کی تواضع میں مصروف ہیں اس لیے ان سے ملاقات ممکن نہ ہوگی۔ اتنی دیر میں ہم لوگ محل کی گول بالکونی کی سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ مسٹر براؤن حذر کرتے ہوئے اندر جانے لگے تو ہم نے مشورہ دیا کہ کتے کو بھی ازراہ کرم ساتھ ہی لے جائیں۔ وہ

مسکراتے اور بولے ”اے یہ؟ یہ بتی کے برابر ہے اس سے کیا ڈرنا؟“ اور یہ کہہ کر عمارت کے اندر غائب ہو گئے۔ ادھر بالکونی میں مسٹر براؤن لیڈی صاحبہ کی محبت میں نمودار ہوئے۔ لیڈی صاحبہ خوبصورت بیش قیمت لباس پہنے ہوئے تھیں اور سر سے پیر تک فیشن کی تصویر بنی ہوئی تھیں عمر چالیس پینتالیس کے لگ بھگ، صورت شکل سے بھی لیڈی ہی نظر آ رہی تھیں۔ انھوں نے مسکرا کر ہم لوگوں کو خوش آمدید کہا اور بلیں کتوں کی بدتمیزی پر معذرت خواہ ہیں۔ جاوید صاحب نے محل کو اندر سے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو بلیوں نے کہ اس وقت تو کچھ مہمان آتے ہوئے ہیں پھر کبھی سہی۔ ”مگر ہم تو لندن واپس چلے جاتیں گے“ ابھی یہ سلسلہ گفتگو جاری ہی تھا کہ دُور سے کسی کتے کے بھونکنے کی خوفناک آواز سنائی دی اور ہم بے اختیار سیڑھیوں کو طے کر کے بالکونی پر پہنچ گئے۔ لیڈی صاحبہ نے پہلے تو حیرت کے ساتھ اور پھر دلچسپی سے ہم لوگوں کو دیکھا۔ مسٹر براؤن غالباً انھیں کتے کی بد اخلاقی کا حال پہلے ہی سنا چکے تھے اور وہ جان گئی تھیں کہ یہ لوگ کتوں کے عادی نہیں ہیں۔ بہر حال انھوں نے صورت حال کو بھانپ لیا اور مسکرا کر بلیوں ”آپ لوگ اندر تشریف لے آئیے۔ مگر میں زیادہ دیر آپ کی میزبانی نہ کر سکوں گی۔“ ان کی سرکردگی میں ہم لوگ گول محل کے اندر داخل ہوئے۔ چھوٹا کتا شاید ہم سے زیادہ محل دیکھنے کا شوق تھا چنانچہ وہ کود کر ہم سے پہلے اندر پہنچ گیا اور نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ دم ہلا کر ہمیں خیر مقدم کہنے لگا۔ یہ بھی شاید لیڈی صاحبہ کی صحبت کا اثر تھا۔ درجہ اس کی گستاخاں ہم کچھ دیر پہلے دیکھ چکے تھے۔

باہر کی میز بستہ ہواؤں اور خوف و خطر کی فضاؤں کے بعد محل کے اندر کا ماحول نہایت دوستانہ اور خوشگوار تھا۔ ہم جس راہداری میں داخل ہوئے وہ حقیقتاً کسی محل کی راہداری نظر آ رہی تھی۔ قیمتی قالین، ریشمی پردے، پُر شکوہ فرونچر، دیواروں پر

بوائے کی شہرت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بالکل مختلف قسم کی فلم ہے۔ بشکل انہیں یقین آیا۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے نہایت کڑی شرطیں لگا دیں اور اس عمل میں شوٹنگ کرنا ہمارے لیے ممکن نہ رہا۔ دراصل بات یہ تھی کہ انہیں اپنے کتوں کے بے آرام ہونے کا ڈر تھا۔ دوسری طرف ہم بھی اُن خورخوار کتوں سے ڈرے ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی



نادر و نایاب، پینٹنگز، چھتوں پر بڑے بڑے فانوس، گیلریاں، بلند دیوار اور دروازے اور کھڑکیاں، غرضیکہ وہ سبھی کچھ تھا جو کسی لارڈ کے محل میں ہونا چاہیے۔ لیڈی صاحبہ ہمارے آگے آگے ہر کمرے کے بارے میں بتاتی ہوتی جا رہی تھیں۔ چند لمحے بعد ہم ہال کمرے میں داخل ہوئے کمرے کی آرائش اور زیبائش دیکھ کر اسیٹ انڈیا کمپنی کا زمانہ یاد آگیا، ہال میں چند حضرات اور خواتین موجود تھیں۔ خواتین قیمتی فیشن ایبل لباسوں میں اور حضرات مکمل انگریزی لباس میں، ایک صاحب جن سے تعارف کرایا گیا خود بھی لارڈ تھے مگر نہایت خوش مزاج اور بااخلاق کھڑے کھڑے تعارف کی رسم ادا ہوتی اور ہم لوگوں نے لیڈی صاحبہ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ ہم اس خوبصورت اور تاریخی محل میں اپنی فلم کی شوٹنگ کرنے کے خواہشمند ہیں۔ فلموں کا تذکرہ نکلا تو جاوید ملک صاحب نے باتوں باتوں میں بتایا کہ ہم لوگ اس سے پہلے انگلینڈ میں ایک اور فلم ”پلے بوائے“ بنا چکے ہیں یہ سنستے ہی کمرے میں ایک لمحے کے لیے سٹاٹا چھایا خواتین نے لمبی ”اوہ“ کی اور مردوں نے کھٹکارنا شروع کر دیا، ہم سمجھ گئے کہ اس لارڈ خانہ ماحول میں ”پلے بوائے“ کا لفظ مناسب نہ تھا۔ ”پلے بوائے“ میگزین اپنی شہرت کے لیے دُنیا بھر میں بدنام ہے اور اس کا نام آتے ہی اس سے وابستہ روایات یاد آنے لگتی ہیں۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ”پلے بوائے“ فلم کا رسالہ ”پلے بوائے“ سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ لارڈ نے یکا یک بلند آواز سے ہنستا شروع کر دیا ان کی دیکھا دیکھی لیڈی صاحبہ بھی ہمتی لگانے لگیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام مہمانوں کے ہاتھوں سے ہال گونج اٹھا۔ ”پلے بوائے“ واقعی؟ لارڈ صاحب نے ہنسی سے بے تاب ہو کر کہا اور پھر ہنسنے لگے مجبوراً ہم لوگوں کو بھی ان سب کے ساتھ ہنسی میں شامل ہونا پڑا اور نہ بدتمیزی سمجھی جاتی کچھ دیر بعد جب قہقروں کا شور کم ہوا تو ہم نے وضاحت پیش کی کہ ”پلے بوائے“ فلم کا رسالہ ”پلے

بھی ہمارے ساتھ تھے۔ فیصل کو ڈیوڈ لین کی فلم میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سائنس
نکشن دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے آدھے دوڑ کے مقابلے میں "پیسج ٹرانڈیا"
کے حق میں دو دوڑ تھے۔ اکثریت کی رائے کے سامنے بے چارے فیصل نے سہر
ٹھیکا دیا۔ جتنی آخر ہم ایک ایسے ملک میں تھے جو جمہوریت کا گوارہ کہا جاتا ہے۔
معلوم ہوا کہ ٹکٹ سب فروخت ہو چکے ہیں۔ فیصل کی تو دلی مراد برآئی۔ مگر ہم
نے ایک سوئیڈ بوٹڈ انگریز کو دیکھا جو چند ٹکٹ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اور نہایت
شگفتہ انگریزی میں دریافت کر رہا تھا کہ آپ کو ٹکٹ تو نہیں چاہیے؟
ہم سمجھے شاید یہ صاحب کسی دوسرے فلم دیکھنے کا ارادہ بدل چکے ہیں۔ فضال صاحب
خوشی خوشی ان کے پاس گئے۔ انھوں نے پوچھا:

”کتنے ٹکٹ چاہتے؟“

”ڈھائی، دو پورے، ایک آدھا۔“

انگریز نے سر سے پیر تک انھیں دیکھا، پھر فیصل پر نظر ڈالی اور بولا:

”آدھا ٹکٹ نہیں ہوتا۔“

فیصل بولے:

”گو میرا تو ہوائی جہاز میں بھی آدھا ٹکٹ لگا ہے۔“

بحث بیکار تھی ہم تین ٹکٹ خریدنے کو تیار ہو گئے۔ مگر معلوم ہوا کہ ساڑھے

چار پونڈ کا ٹکٹ ساڑھے سات پونڈ میں ملے گا۔ لندن میں یہ ٹکٹوں کی بلیک کا

پہلا واقعہ تھا جو ہمیں پیش آیا۔ مگر فضال صاحب بھارتی ذکر کرنے لگے۔

”تین ٹکٹ پندرہ پونڈ۔“

”تین ٹکٹ پندرہ پونڈ۔“

اتنی دیر میں ایک عدد خاتون ہانپتی کانپتی آگئیں اور ساڑھے سات پونڈ میں

لندن کے بلکے

”اے پیسج ٹرانڈیا“ پچھلے دنوں لندن میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ شہزادہ
چارلس اور شہزادی ڈیانا کے علاوہ شاہی خاندان کے دوسرے لوگ بھی اس فلم کے
پریمیئر کے موقع پر موجود تھے۔ ہم ان دنوں لندن میں نہیں تھے۔ لیکن فلم دیکھنے کا
اشتیاق تھا۔ ای ایم فارسٹر کا ڈرامہ اور ڈیوڈ لین کی ہدایت کاری ظاہر ہے لندن میں
جو فلمیں دیکھی تھیں ان میں سرفہرست یہی فلم تھی۔

آغاز میں یہی فلم چیدہ چیدہ سینما گھروں میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ ہم
دوسرے ہفتے دیکھنے کے لیے پہنچے مگر تپہ چلا کہ اگلے ہفتے سے پہلے کوئی ٹکٹ نہیں ہے
مجبوراً واپس آگئے۔ لیکن سینما آنے جانے میں ہمارا پرس گم ہو گیا۔ جس میں نقد رقم
کے علاوہ دوسرے ضروری کاغذات، ٹیلی فون کی نوٹ بک اور ڈرائیونگ لائسنس بھی
تھا۔ تلاش کے باوجود پرس نہ مل سکا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ فلم ہمیں کافی
مہنگی پڑی۔

دوسرے ہفتے یہ فلم لندن کے دوسرے تمام علاقوں میں بھی نمائش کے لیے پیش
کر دی گئی۔ جمعہ کی شام کو ہم شیلف بری ایونیو کے ایک سینما میں فلم دیکھنے گئے۔ اس
کی طوالت زیادہ ہے اس لیے ہر روز صرف دو شہر ہوتے ہیں۔ سینما گھر کے سامنے خاصا
ہجوم تھا جسے دیکھ کر ہم پھر یاکس ہو گئے۔ اداکار فضال اور ان کے کم سن بھتیجے فیصل

کم سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ کوئی اکاؤنٹ آدمی سگریٹ سے شوق فرماتا ہے اور وہ بھی بہت احتیاط سے۔ افضل صاحب نے یہ کیا کہ سگریٹ کو خاص پاکستانی اسٹائل میں مٹھی میں دبایا اور گے کش پرکش لینے۔ جب تک انہوں نے تین سگریٹ ختم کیے اس پاس کا علاقہ دھواں دھار ہو چکا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ فلم کی خوبیوں کی داد بھی بلند آواز دیتے جا رہے تھے۔ بہر حال سگریٹ کے بعد ہم نے ان سے درخواست کی کہ اب وہ فی الحال سگریٹ نہ سں گائیں۔ فلم بھی بڑے دلچسپ اور نازک مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ بلا پس و پیش مان گئے۔

اس فلم کا اسٹیج پلے کئی سال پہلے دنیا بھر میں دکھایا جا چکا ہے اور اس وقت بھی ڈرامے کو بہت شہرت حاصل ہوتی اور داد ملی تھی۔ اس فلم کا مرکزی کردار دراصل ایک ہندوستانی ڈاکٹر عزیز ہے، ڈرامے میں یہ کردار پاکستان کے ضیاء محمد الدین نے بڑی ہمارت اور خوبصورتی سے ادا کیا تھا اور نقادوں سے داد وصول کی تھی۔ فلم میں یہ کردار ایک ہندوستانی بزمی نے ادا کیا اور اچھا ہی کیا ہے، مگر ضیاء محمد الدین والی بات نہیں ہے۔

اٹھارویں صدی کے آخر کے ہندوستان کا نقشہ ڈیوڈ لین نے بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا اب انگلستان سے ہندوستان آنے والے سرکاری ملازم ملک کے ماحول سے مانوس ہو چکے تھے اور ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں اس کا رویہ بدل چکا تھا۔ بہت سے کلبوں وغیرہ میں ہندوستانیوں کا داخلہ بند تھا۔ انگریز حاکم دسی لوگوں کو کم تر سمجھنے لگے تھے۔ اگرچہ کوئی کوئی ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بولتا تھا مگر وہ زمانہ گزر چکا تھا جب انگریز ہندوستان میں اردو اور فارسی لکھنا اور بولنا ضروری سمجھتے تھے۔

”اے پیسج ٹوانڈیا“ ایک گہری روحانی فلم بھی ہے اگرچہ ایک بھی روحانی منظر

ایک ٹکٹ لینے پر آمادہ ہو گئیں۔ ہم نے افضل صاحب کو اشارہ کیا کہ مان لوورہ اس سے بھی جائیں گے۔ لیجئے صاحب اس سوئیڈ لوئیڈ انگریز نے سینما کے بالکل سامنے، کھلم کھلا ہمیں بلیک میں ٹکٹ فروخت کر دیے۔ فیصل نے چپکے سے کان میں کہا:

”چچا پولیس والے سے کہہ کر اسے پکڑوا دیجئے۔“
مگر ہم کو تو فلم دیکھنے کی دھن تھی۔ اور پھر یہ بھی خبر نہیں کہ لندن میں ٹکٹوں کی بلیک کوئی بھرم بھی بنے یا نہیں۔ انگریز بلیک مار کٹتے نے ہم سے کہا:

”جلدی جائیے، سائیڈ پروگرام چل رہا ہے۔“
سینما ہال میں داخل ہوئے، سائیڈ پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ فلم کے ٹائٹلز شروع ہو چکے تھے جیسا کہ شاید آپ کو علم ہوگا یہ فلم اٹھارویں صدی کے آخری زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک انگریز خاتون مسز موراپنے بیٹے سے ملنے اور ہندوستان دیکھنے کے لیے انگلستان سے روانہ ہو رہی ہیں جو وہاں ایک ضلع میں سٹی مجسٹریٹ ہے۔ ان کے بیٹے کی منیجر بھی سیر کی غرض سے اور منیجر سے ملنے کے لیے ان کے ہمراہ ہیں۔ جن بحری جہاز میں وہ سفر کر رہی ہیں، اسی میں ہندوستان کے وائسرائے بھی جا رہے ہیں۔ اس دور کا لندن تو ہم نے پہلے بھی فلموں میں دیکھا ہے مگر ڈیوڈ لین نے اس عہد کے ہندوستان کا نقشہ بھی دکھا دیا اور بہت حد تک حقیقت سے قریب۔

فلم نے آغاز ہی سے تجربہ اپنی طرف کھینچ لی۔ افضل صاحب فلم میں کھوتے ہوتے تھے مگر سگریٹ کی طلب بھی ستا رہی تھی۔ انہوں نے جھٹ ایک سگریٹ سں گائی۔ اب رواج یہ ہے کہ یہاں سینما گھروں میں ”تبکو نوشی منع ہے“ قسم کی کوئی ہدایت نہیں لکھی ہوتی۔ ہر سیٹ کے ساتھ ایش ٹرے بھی لگی ہوتی ہے۔ مگر لوگ بہت

سے زیادہ خواب لگتا ہے۔

اس فلم کی نمائش نے بھارت کو ایک بار پھر سیلٹی دے دی ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی کے لیے کئی مناظر اور ماحول موجود ہیں۔ اس فلم کی ایک خاص بات اس کا جذباتی تاثر ہے۔ ایک بھارتی اور پاکستانی فلم کی طرح یہ دیکھنے والوں کے دلوں پر اثر کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے مغربی تماشائیوں کو فلم کی یہی جذباتیت پسند نہ آتی ہو۔ مگر موضوع کے اعتبار سے یہ ایک خوبصورت فلم ہے۔ اپنے نام کے باوجود اس فلم کو "گاندھی" جیسا قبول عام حاصل نہیں ہو سکا۔ نہ ایوارڈ کی بارش ہوئی۔ حالانکہ بطور فلم ایک بہتر فلم ہے۔

فلم دیکھ کر سینما ہال سے باہر نکلے تو پکا ڈلی سرکس کے علاقے میں "ہری رام" ہر کرشنا" کا جاپ کرتے ہوئے ایک مختصر سا گروہ جا رہا تھا۔ ہندو لباسوں اور جلیوں میں انگریز مرد اور عورتیں سینما کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ یہ تحریک اب بہت پرانی ہو چکی ہے اور مقامی آبادی اور سیاحوں کو بھی اب اس نظارے میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ لیکن آج سے پندرہ سولہ سال پہلے اس کا بہت زور شور تھا اور ان دنوں لندن کی سڑکوں پر چوٹیوں والے انگریز، جینیوگے میں ڈالے اور دھوتیاں پہنے، اسی لباس میں لپٹی ہوئی انگریز لڑکیوں کے ساتھ "ہرے کرشنا ہرے رام" کے نعرے لگاتے ہوئے اکثر نظر آتا کرتے تھے۔ اب انہوں میں بھی وہ زور نہیں رہا اور شاید اس کی دلکشی بھی کم ہو چکی ہے مگر پہلے درپے چند فلموں کی نمائش نے بھارت میں دنیا بھر کے لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فلم کا ذریعہ کتنا مؤثر ہے۔

اس فلم میں ایک ہندو پنڈت پروفیسر کا کردار نامور برٹش اداکار سرائیکنگس نے بھی ادا کیا ہے۔ مختصر کردار ہے مگر گیٹ آپ اور میک آپ کے علاوہ اپنی اداکاری

یا مکالمہ ساری فلم میں موجود نہیں ہے) اور اس کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ انصاف پسند اور جمہوریت نواز انگریز انتظامی جذبے کا شکار ہو کر کس طرح انصاف کا کلا گھونٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ ڈاکٹر عزیز کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بے چارے ایک انگریز سٹی مجسٹریٹ کی منگیتر کو تاریخی مقامات دکھانے کے لیے لے گئے مگر ایک حادثے کی وجہ سے سٹی مجسٹریٹ کے عقاب میں آ گئے۔ گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، وہ تو بکیتے خیر ہوتی کہ منگیتر نے عدالت میں سچ بول دیا اور ڈاکٹر عزیز کو رہائی مل گئی۔ اس دوران میں "انڈیا چھوڑ دو" کے نعرے بھی بلند ہوئے۔ مقامی آبادی نے ڈاکٹر عزیز کی حمایت میں جلسے نکالے۔ عدالت پر دھاوا بول دیا۔ بہر حال انگریزی انصاف کا بھانڈا پھوٹ گیا۔

یہ نہیں کہ سبھی انگریز کردار کے متعصب تھے۔ مقررہ ایک بہت کشادہ دل اور راجدانی خاتون تھیں۔ ایک مقامی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر فیڈلنگ کا کردار بھی بہت خوب ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو ہر قسم کے تعصب سے پاک ہے اور ڈاکٹر عزیز کی حمایت میں سارے انگریز افسروں کی مخالفت مول لیتا ہے۔ سب سے موثر اور خوبصورت کردار منگیتر کا ہے۔ فلم کی کہانی بیان کر کے کہانی کا تجسس ختم نہیں کرنا چاہتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک اسٹیج پلے کو ڈیڑھ لائن نے بہت خوبصورتی اور ہنرمندی سے فلم کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ (بہترین معاون اداکارہ کے اسکرین ایوارڈ کے سوا) یہ فلم کوئی آسکر ایوارڈ حاصل نہ کر سکی۔ مگر فلم کے ہر فریم اور ہر منظر پر ڈیڑھ لائن کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ اداکاری کا معیار بھی بہت اچھا ہے۔ لیکن شاید ضیا۔ محی الدین ڈاکٹر عزیز کے کردار کے ساتھ زیادہ بہتر طور پر انصاف کرتے۔

انگریز حاکموں کی جانب داری کے مناظر سینما ہال میں بیٹھے ہوتے انگریز تماشائی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ یوں بھی اب یہ ایک گوری ہوتی داستان ہے۔ قصہ پارینہ حقیقت

کے ذریعہ ایک گینس نے اسے ایک جیتا جاگتا کردار بنا دیا ہے۔ اس کردار کی خوبصورتی یہ ہے کہ مکالمے برائے نام ادا کیے ہیں مگر تاثرات کے ذریعہ بھی کچھ کہہ گئے ہیں۔



قصہ پُرانے کیسل کا

ایک فلم ”ہم اور تم“ کی شوٹنگ کے سلسلے میں یہاں آتے ہیں جس کی تمام تر فلم بندی یورپ میں ہوگی۔ سلی آغا اور جاوید شیخ اس فلم میں مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔ پاکستان کے دوسرے اداکاروں میں ننھا اور افضل شامل ہیں جب کہ باقی اداکار انگلستان ہی سے لیے گئے ہیں۔ یہ ایک رومانی اور میوزیکل کہانی ہے جس میں وہ تمام لوازمات بھی موجود ہیں جو ہماری فلموں میں ضروری ہوتے ہیں۔ پس منظر یورپ اور انگلستان کا ہے اور تمام ترکہاں اسی پس منظر میں شروع ہوتی ہے اور یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ اسے آپ ایک ”لو اسٹوری“ بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہماری ترساری ہی فلمیں ”لو اسٹوری“ ہوتی ہیں۔ ایک لڑکا ہے، ایک لڑکی ہے، آپس میں پیار کرتے ہیں، راستے میں زمانے اور سماج کی دیواریں حائل ہو جاتی ہیں، مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فلم کے اختتام پر اکثر یہ بل جاتے ہیں اور کبھی کبھار یہ بچھڑ بھی جاتے ہیں۔ بل جاتیں تو اسے ”ہی اینڈنگ“ کہا جاتا ہے اور ہمارے تماشائیوں کی بہت بڑی اکثریت خوشی کا انجام ہی پسند کرتی ہے چاہے برمیانی عرصے میں کتنی ہی پریشانیاں اور مصیبتیں نازل ہوں اور رورو کر دیکھنے والے (خصوصاً خواتین) ہلکان ہو جائیں۔ کبھی کبھی المٹاک اختتام بھی تماشائیوں کو پسند آ جاتا ہے بشرطیکہ ان کے دل کو لگ جاتے۔ اس کہانی کے درمیان میں ناچ گانے، ڈرامہ،

لڑائی مارکٹائی، آنسو، خوشیاں، بلنا، بچھڑنا اور پھر ملنا۔ پولیس، ڈاکو، غنڈے اسمگلر یہ سب بوقت ضرورت آتے جاتے رہتے ہیں اور ہمارے تماشائیوں کے دل بہلانے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ بہر حال آپ اسے ایک لو اسٹوری کہہ سکتے ہیں۔ کہہ لیجئے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

اب قصہ یہ ہے کہ فلم کی ہیروئن ایک بہت دولت مند باپ کی اکلوتی لادلی بیٹی ہے، باقی سب کو چھوڑتے۔ پہلی شکل تو یہ پیدا ہوتی کہ انگلستان میں رہنے والے ایک دولت مند باپ کو کیسا ہونا چاہیے اور اس کی لادلی منہ چڑھی بیٹی کیسی ہوگی؟ ظاہر ہے یہ عمل ناممکن میں رہتے ہوں گے قیمتی جہک دار کاریں پھلاتے ہوں گے، نوکر چاکر ہوں گے، ذاتی ہوائی جہاز ہوں گے، ذاتی بحیرہ ہوگا۔ گویا سارا نام جہاں جو کسی انگریز دولت مند کے پاس ہونا چاہیے، ایک پاکستانی فلم جو ایک محدود سرمائے سے بنائی جاتی ہے اس کے لیے یہ سارا سامان فراہم کرنا خاصا مشکل ہے۔

پہلا مرحلہ یہ تھا کہ اس دولت مند ہیروئن کی شایان شان دوسری چیزوں کے علاوہ مکان تلاش کیا جائے۔ اب ہم آپ کو اس مکان کی تلاش کا قصہ سناتے ہیں۔ انگلستان اور یورپ کے عام اور متوسط طبقے کے لوگ جن گھروں میں رہتے ہیں وہ گنجائش کے لحاظ سے ہمارے دس مرلے کے گھروں سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ بھی چھوٹے گھروں اور فلیٹوں میں رہنے کے عادی ہیں۔ بہت زیادہ دولت مند اور خاندانی رئیسوں نے اپنے لیے پُر شکوہ محل ناممکن اور کیسل بنائے۔ ہمیں ایسے ہی کیسل کی ضرورت تھی جس کی کھوج میں سب لگے ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کیسل لارڈز کی ملکیت ہوتے ہیں۔ جن کی اکثریت اب غریب ہو چکی ہے اور انھوں نے اپنے محل فروخت کر دیئے ہیں یا نمائش گاہ اور میوزیم بنا دیئے ہیں یا پھر انھیں ہوٹلوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جن لارڈز کو اثند نے ابھی تک روپے پیسے سے نوازا ہے وہ اب

بھی اپنے کیسل میں رہتے ہیں۔ اس قسم کے کسی لارڈز سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی رہائش گاہ میں کسی کو شوٹنگ کی اجازت دے دے گا اور وہ بھی کسی پاکستانی فلم ساز کو، ایس محال است دجوز والا معاملہ ہے چنانچہ اس سلسلے میں تو مکمل ناکامی ہوئی۔ اب رہ گئے وہ کیسل جو نمائش گاہ بن چکے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہاں بھی سیاہوں اور دیکھنے والوں کا تانا بندا رہتا ہے۔ بھلا وہاں کب اور کیسے فلم کی شوٹنگ ہو سکتی ہے؟ پھر بھی میں نے اور ہدایت کار حسن عسکری نے کئی کیسل دیکھے جو انگلستان کے دور دراز علاقوں میں واقع ہیں اور واقعی قابل دید ہیں ان کی عمارتیں۔ ان کا فرنیچر۔ اس پاس کے باغات۔ قیمتی قالین۔ قدیم نوادرات اور تصاویر۔ قابل دید فانوس، سبھی کچھ آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ کیسل بشیار اکیٹر بنے افرادوں درختوں، باغوں اور جھیلوں سے گھرے ہوتے ہیں۔ بھٹی واہ کیا ٹھٹھ سے یہ لارڈز رہتے ہوں گے، ہمارے پڑانے رئیسوں کی حویلیاں تو ان کے مقابلے میں بیسج ہیں۔ ان مقامات پر فلم بندی کی اجازت نہ مل سکی اور اگر کوئی لارڈ صاحب رضا مند بھی ہوتے ان عجائب گھر نامکانوں کی دیکھ بھال اور نگرانی پرنے لارڈز بذات خود کرتے ہیں تو ایسی شرطیں عائد کر دیں کہ جن کا پورا کرنا ناممکن۔ مثلاً مقررہ گھنٹوں میں کام ہوگا۔ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا، صفائی کا خیال رکھا جائے گا، سگریٹ کی راکھ تک فرش پر نہیں گرائی جائے گی۔ منتخب اور محدودے چند افراد ہی عمارت کے اندر داخل ہو سکیں گے، شور و غل بالکل نہ ہوگا، سیاہوں کو ڈسٹرب نہیں کیا جائے گا، پالٹن گتوں کے مزاج اور عادات کے خلاف کوئی حرکت نہیں کی جائے گی (ان کے مزاج اور عادات کو جاننے کے لیے بھی ہفتے درکار ہیں) کہ یہ بہت زیادہ ہوگا، باقاعدہ تحریری معاہدہ کرنا ہوگا معاہدے کو قانونی مشیر ترتیب دیں گے جن کی فیس الگ ہوگی پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ عمارت میں شوٹنگ کرنے کے لیے بھاری انشورنس کرانی

کنا چاہتے ور نہ
 ہوٹل کا دروازہ قدیم لکڑی کا ہے جس پر لہجے کا گنڈا لگا ہوا ہے۔ ہم نے گنڈا
 دوتین بار دروازے پر مار کر بجایا۔
 ”بس بس بس“

ڈیو صاحب بھاگے ہوئے آئے۔

”ایک ہی بار دستک دینا کافی ہے، وہ بُرا مان جائیں گے“

چند لمبے بعد دروازہ کھلا سامنے ایک انگریز کھڑے تھے۔ سوٹ بوٹ پہنے ہوئے
 سر سے ننگے۔ دُور سے دیکھنے پر ۲۵ سال کے نظر آتے تھے، قریب سے دیکھو تو چالیس
 بیالیس سال کے لگتے تھے مگر دراصل ان کی عمر ۶۵ سال ہے۔ چھوٹے قد کے پھرتیلے
 آدمی ہیں، بال قدر قی بھورے ہیں۔ انگریزوں کے بالوں سے ان کی عمر کا اندازہ نہیں
 لگایا جاسکتا۔ کئی کم عمر لڑکوں لڑکیوں کے بال سفید اور بھورے ہوتے ہیں۔ ہمارے
 ہاں اکثر لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا چور بدن ہے یعنی دُبے نظر آتے
 ہیں مگر صحت مند ہوتے ہیں ان صاحب کو کہہ سکتے ہیں کہ ”چور“ عمر کے ہیں۔ دیکھنے
 میں کچھ اور دراصل عمر کچھ اور۔

خیر۔ ان سے تعارف ہوا۔ بہت رسمی انداز میں۔ انھوں نے باقاعدہ سب سے
 مصافحہ کیا اور اخلاقاً تقسیم بھی کیا، نام ان کا مسٹر کنگ ہے۔ ان کے باپ دادا اس
 محل کے مالک اور لارڈ تھے۔ اب یہ ہوٹل چلاتے ہیں۔ خود کوزہ و خود کوزہ گرد و خود گل
 کوزہ والی بات ہے۔ یعنی یہ ان کی بیگم اور ان کی صاحبزادی اس ہوٹل کا کُل اسٹاف ہے۔
 مسٹر کنگ بہت گاڑھی انگریزی بول رہے تھے جسے چھان پٹک کر چند مطلب کے الفاظ
 ہم لوگوں کے پتے پڑ جاتے تھے عمارت کے اندر گئے تو خوبصورت لاؤنج۔ قدیم قالینوں
 اور فرنیچر سے سجایا ہوا۔ دیواروں پر تلواریں اور خنجر لگے ہوئے آرائش کے لیے لکڑی

ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ آپ تو شاید مذکورہ بالا شرائط سن کر ہی گھبرائے ہوں گے۔ ان
 حالات میں یہی کہا جاسکتا تھا کہ مافی لارڈ بہتر ہے کہ آپ اتنی لمبی چوڑی تقریر کرنے
 کی بجائے صرف ایک لفظ ”سوری“ کہہ کر اپنی اور ہماری مشکل آسان کر دیں۔
 اب دوسری قسم کے محل باقی رہ گئے جو ہوٹلوں میں تبدیل کر دیتے گئے ہیں۔
 انگلستان میں جو انگریز منتظم اعلیٰ ہماری پروڈکشن کے انتظامات کے ذمہ دار ہیں ان
 کا نام ڈیو ہے (پیو کے وزن پر دیون سمجھ لیجئے گا) مگر کام کرنے کے معاملے میں وہ دیو
 سے کم نہیں ہیں۔ آخر کار انھوں نے ایسے ہوٹلوں کی فہرست تیار کر لی جو ہمارے کام بھی
 آسکتے تھے اور جن کے منتقلین نے فلم بندی کا نام سُنتے ہی ”سوری“ نہیں کہا تھا۔ لیجئے
 اب ہم ایک ایسے ہی ہوٹل کا رخ کر رہے ہیں۔ یہ ہوٹل انگلستان کے اندرونی علاقے
 ڈیرن شائر کے اندرونی قصبے شیلڈن کے ایک اندرونی خطے میں واقع ہے، ابھی یہاں
 سیاحوں کا موسم شروع نہیں ہوا اس لیے نہان بہت کم ہیں۔ مئی کے آخری ہفتے سے
 مہانوں کی بھر مار ہو جاتے گی اس لیے فی الحال وہاں فلم بندی کی اجازت ملنے کا امکان
 ہے بشرطیکہ

کلر سبزہ زاروں پہاڑیوں اور اونچی نیچی سڑکوں سے گزرتی ہوئی اس ہوٹل کی
 طرف جا رہی ہے۔ سڑک پتلی ہے مگر ہر جگہ ٹریفک کے ساتھ موجود ہیں۔ دور دراز
 گاؤں کی پختہ اور صاف سڑک کے دونوں طرف خوبصورتی سے ترشی ہوتی باڑھ بھی
 ہے ہوٹل کے بورڈ کو دیکھ کر دروازے میں داخل ہوتے۔ دُور تک لمبی سڑک سبزے اور
 درختوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔ کچھ دُور چلنے کے بعد ہوٹل کی عمارت نظر آتی۔ یہ
 اینٹوں اور پتھروں کی بنی ہوئی قدیم خوبصورت عمارت ہے۔ آس پاس میدان اور باغ ایک
 سمت گہرائی میں دریا بہ رہا ہے، بہت دلفریب منظر ہے۔ مسٹر ڈیو نے آخری منٹ پھر
 ہدایت دیں کہ یہ صاحب پُرلے ٹائپ کے ہیں اس لیے ان سے کیا کنا چاہیے اور کیا نہیں

لینے والا مسٹر کنگ کا گناہ تھا جو دوسرے کمرے میں ایک صوفے پر سو رہا تھا۔ گناہ تو اس کا نام تھا۔ سائز میں کراچی کے کسی گھر سے ہرگز کم نہیں ہوگا۔ فرق صرف یہ کہ اس کتے کے بال زیادہ لمبے تھے اور سفید تھے۔ انگریز گناہ جو ہوا۔ اس کتے کی دوسری غریبی یہ بتائی گئی کہ بے چارہ اندھا ہے کچھ نظر نہیں آتا۔ ٹول بھی نہیں سکتا۔ صرف سونگھ کر راستہ تلاش کرتا ہے۔ بعد میں بھی جب شرف ملاقات حاصل ہوا، ہم نے اسے سوتے اور خڑاٹے لیتے ہوتے ہی پایا۔ خدا جانے کچھ کھاتا پیتا بھی ہے یا سوتا ہی رہتا ہے؟

مسٹر کنگ سے ہم نے پوچھا کہ صاحب آپ اتنی حفاظت اور ضمانت طلبی کیوں کرتے ہیں، کہنے لگے۔ یہ پانچ سو سال پُرانا گھر ہے ہر چیز قدیم ہے اور اب تو نوادرات میں شمار ہوتی ہے۔

یہ میز دیکھتے۔ یہ کرسیاں دیکھتے۔ یہ ڈنڈا دیکھتے۔ یہ آتش دان دیکھتے بلکہ آگ گرہنے والا لوہے کا یہ چٹا دیکھتے۔ ہم نے سب چیزیں غور سے دیکھیں۔ چپٹیں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ بولے یہ چٹا فلاں بادشاہ نے ہمارے فلاں رشتے دار کو دیا تھا۔ اس کی قیمت ہزاروں میں ہے۔ پھر وہ اس بات پر اظہارِ افسوس کرتے رہے کہ انگلستان کا قدیم تہذیبی سرمایہ اور نوادرات امریکن اور دوسرے دولت مند لوگ ہنگے داموں خرید کر لے جا رہے ہیں۔ انگلستان تو کنگال ہو رہا ہے۔ ہم نے سوچا کنگال تو ہونا تھا۔ ساری نوآبادیاں ہاتھ سے نکل گئی ہیں۔ اب تو اپنے دست و بازو پر گزارا ہے۔ مگر ان کا مطلب یہ تھا کہ تہذیبی ورثے سے بھی محروم ہو رہا ہے۔ ہم نے ان کو تسلی دینے کے لیے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ اٹھانے والی چیزیں ہی تو لوگ لے جاتیں گے، عمارتیں تو یہیں رہیں گی نا۔“

کی تیج دار سیڑھیاں اُپر جاتی ہوتی، ایک طرف قدیم قیمتی فرنیچر ہے آراستہ ڈرائنگ روم۔ دوسری طرف ایک کمرہ جس کو بار بنایا گیا ہے، تیسری طرف باورچی خانہ، چوتھی طرف کچھ اور کمرے، یہ پختی منزل تھی اُپر کی منزل پر دس بارہ کمرے، بس اس ہوٹل میں اس سے زیادہ مہمان نہیں ٹھہر سکتے گویا ڈبل روم ہوں تو چوبیس پچیس مہمان۔ ہدایت کار حسن عسکری نے ہوٹل کے ایک دو کمرے شوٹنگ کے لیے پسند کیے اور ہم سب لاونچ میں آکر کاروباری بات چیت کی غرض سے بیٹھ گئے باہر سخت سردی اور کمرہ تھی۔ مگر کیا مجال جو مسٹر کنگ نے جھوٹے منہ بھی چاتے کے لیے پوچھا ہو۔ اچھے خاندانی رئیس ہیں۔ مگر یہ انگریز ایسے ہی سرد مہر ہوتے ہیں، ہمارا ملک ہوتا اور کوئی فقیر بھی ہوتا تو چاتے، دودھ، لسی سے خاطر کرتا اور پلاٹے بغیر نہ چھوڑتا۔ مگر یہ ٹرے انگریز، جب ان سے پیسے ادا کر کے چاتے طلب کی گئی تو انھوں نے بہت اخلاق سے معذرت کی اور کہا کہ سنا اس وقت حساب کر رہی ہیں، چاتے چار بجے سے پہلے نہیں مل سکتی۔ لیجئے قصہ ختم ہوا۔

مسٹر کنگ خالص انگریز آدمی نکلے۔ بلکہ آدمی بھی کیا محض انگریز۔ انھیں دودن کی شوٹنگ کی اجازت کے لیے حوالے اور سفارشی خطوط درکار تھے۔ ضمانت چاہیے تھی۔ نقد بھی اور کسی ادارے کی بھی۔ خیر کافی دیر تک بات چیت رہی۔ انھیں مناسب حوالے اور سفارشی فراہم کی گئیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ ان لوگوں سے تصدیق کرنے کے بعد اجازت دیں گے۔ بات چیت جاری تھی مگر ہمیں کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی خڑاٹے لے رہا ہے۔ پہلے تو اپنا دواہم خیال کیا مگر کچھ دیر بعد خڑاٹے بلند ہو گئے اور عجیب دردناک قسم کے خڑاٹے تھے۔ ہم حیران کہ الہی کیا ماجرا ہے۔ سب لوگ سامنے موجود ہیں اور جاگ رہے ہیں پھر جاگتے ہیں خڑاٹے کون لے سکتا ہے؟ اور وہ بھی ایسے خوفناک۔ پھر سوچا کہیں اس پُرانے گھر پر آسیب کا اثر نہ ہو۔ مگر کچھ دیر بعد پرابلم حل ہو گئی۔ خڑاٹے

بولے ”کاش ایسا ہی ہوتا تو، ہم اس کو عینک پہنا دیتے۔ مگر وہ تو بالکل اندھا ہو چکا ہے۔“

”مگر بھونکتا کیوں نہیں۔ کیا آنکھوں کے ساتھ گویا قی سے بھی محروم ہو گیا؟“

کہنے لگے۔

”جی نہیں، دراصل وہ بلا وجہ بھونکنے کا قائل نہیں۔ جب تک کوئی قابل اعتراض چیز اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے بھونکنا فضول سمجھتا ہے۔ اب کیونکہ دیکھ ہی نہیں سکتا اس لیے تصدیق کے بغیر بھونکنا اس کا مسلک نہیں ہے۔“

واقعی۔ گتا ہو تو ایسا با اصول در نہ بہتر ہے کہ انسان آدمی ہی بن جاتے۔



انہوں نے تلخی سے کہا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ پچھلے دنوں ایک ارب پتی امریکی کم بخت نے ایک کیسل خریدا اور اسے توڑ کر اپنے ملک لے گیا۔ اب وہاں اسے دوبارہ اس نے تعمیر کر لیا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ غصے سے بیچ دتا بکھلنے لگے۔ واقعی، ہم نے سوچا، یہ تو پریشانی کی بات ہے۔ اگر عمارتیں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو کیا ہوگا۔ ذرا غور فرمائیے کہ لندن کی بگ مین، پارلیمنٹ ہاؤس اور بکنگھم پلس اگر کسی دن آپ کو نیویارک، کیلی فورنیا یا کویت میں نظر آگئے تو کیا غضب ہوگا۔ اور انگریز کے دل پر کیا گزریگی؟

ہمارے پاس مسٹر کنگ کو دینے کے لیے لفظی تلبیوں کے سوا اور کیا تھا۔ انہوں نے غور سے ہو کر ہمارا احوال اپنی بیوی اور بیٹی سے کرایا۔ ہم نے دیکھا کہ بیوی سے ڈرتے ہیں۔ وہ ان پر حاوی ہیں۔ بیٹی بھی ماں باپ کی طرح خالص انگریز۔ کیا مجال جو مسکراہٹ چہرے پر آجائے۔ اور الفاظ تو ایسے ناپ تول کر استعمال کرتی ہیں۔ جیسے حکیم لوگ خاندانی نسخوں میں دوائیاں استعمال کرتے ہیں۔ رقی بھر کا اضافہ ہو گیا تو سمجھو مریض کیا جان سے۔ سب سے آخر میں ہم نے درخواست کی کہ ہمیں گتے صاحب سے بھی ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ یہ سن کر سارا خاندان سوچ میں پڑ گیا۔ آخر مسٹر کنگ بولے کہ جناب یہ اس کے آرام کا وقت ہے۔ ہم نے کہا۔

”وہ تو ظاہر ہے ہم اس کے خزانے میں رہے ہیں۔“

کہنے لگے۔

”بھئی اب تو یہی رہ گیا ہے اس کے پاس۔ نہ دیکھ سکتا ہے نہ بھونکتا ہے۔“

”کیا آنکھیں کمزور ہیں؟“ ایک صاحب نے ہمدردی سے پوچھا۔

ہیں جب یہاں متواتر کئی ہفتے تیز دھوپ ٹپکتی ہے اور بارش نہیں ہوتی۔ ان دنوں میں درختوں کو سیراب کرنے اور نہلانے کے لیے خاص طور پر انتہام کیا جاتا ہے۔ اگر ٹھکے کی طرف غفلت ہو تو لوگ گردن ناپتے ہیں۔ ایسے ہی ایک گرم و خشک موسم میں ایک صاحب نے باغات اور درختوں کے ٹھکے کو فون کیا اور کہا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ دودن سے میرے درخت کو نہلایا نہیں گیا۔ اس پر گرد و غبار چھایا ہوا ہے، یہاں گرد و غبار نہیں ہوتا۔ درخت تو کیا یہاں تو انسانوں کو ہفتوں نہانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مگر یہ واقعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ لوگ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے کتنی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور درختوں اور باغوں کو اپنی ذاتی ملکیت تصور کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہم درختوں کو کاٹ کر جلا لیتے ہیں۔ پتے بکریاں چر جاتی ہیں۔ شاخیں بچے ٹک ٹک کر توڑ دیتے ہیں۔ رہنے نہ کاشت کیے جانے والے پودے تو ان بے چاروں کا تو نو زائیدگی کے عالم ہی میں انتقال ہو جاتا ہے۔

مگر ایک بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ پچھلے چند سالوں میں کم از کم لاہور میں پرانے باغوں کی دیکھ بھال اور نئے باغ لگانے کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ شہر کے مختلف علاقوں میں نئے نئے، وسیع اور خوبصورت باغ لگاتے جا رہے ہیں۔ پرانے باغوں پر بھی نظر کرم ہوتی ہے۔ دیکھتے یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا ہے۔ لیکن اب اتنا ضرور ہے کہ ہم دوبارہ لاہور کو باغوں کا شہر کہہ سکتے ہیں۔

میں لکھنے کے باغوں کا تذکرہ کر رہا تھا۔ یوں تو اس گنجان آباد اور غدار شہر میں جگہ جگہ سبزہ زار اور چھوٹے چھوٹے باغ موجود ہیں جن کی وجہ سے شہر کھلا کھلا اور تازہ دم لگتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ لندن اپنے باغات پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے مغرب کے لوگوں نے اپنا نظریہ حیات بنا لیا ہے کہ وہ ہر چیز کا ٹیکنیکل اور افادی پہلو ضرور مد نظر رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر باغوں ہی کو دیکھ لیجئے۔ لندن کے باغ محض نظروں ہی

باغوں کا شہر!

لندن کو باغوں کا شہر کہتے ہیں۔ دنیا بھر میں یہ اپنے باغات کی وجہ سے مشہور ہے۔ باغوں کا شہر تو اپنا لاہور بھی ہے۔ کسی زمانے میں لاہور میں بھی بہت سے باغ تھے۔ ان کی نگہداشت بھی خوب ہوا کرتی تھی۔ مگر پھر امتداد زمانہ اور ایل ڈی اے نے مل جل کر ان گلستانوں کو صحراؤں میں تبدیل کر دیا۔ کچھ باغات بے اعتنائی اور غفلت کا شکار ہو گئے۔ کچھ کو سڑکوں کو چوڑا کرنے کے لیے ختم کر دیا گیا۔ اور تو اور ایل ڈی اے نے تو لاہور کو خوبصورت بنانے کی غرض سے بے شمار قدیم خوبصورت سایہ دار درخت بھی کاٹ کر پھینک دیئے۔ حالانکہ ہمارے ملک کا تو موسم بھی ایسا ہے کہ گھنے سایہ دار درخت ہماری ضرورت ہیں۔ سایہ دار درخت لگانے کی توفیق تو ہوتی نہیں، جو موجود تھے، انہیں بھی سڑکوں کی خوبصورتی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ یہی حال سبزے کے تختوں کا بھی ہوا۔ اب یہ دیکھتے کہ یورپ میں بارشیں اتنی ہوتی ہیں کہ سبزہ زار خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر گرمی کی وہ شدت بھی نہیں کہ انسان اور حیوان سایہ دار جگہیں تلاش کرتے پھریں۔ اس کے باوجود یہاں درختوں کی کثرت ہے۔ سڑکوں پر، بازاروں میں گلیوں میں ہر جگہ اونچے اونچے درخت سر اٹھاتے کھڑے ہیں۔ پھر لوگوں کو ان درختوں سے محبت بھی اتنی ہے جیسے اپنے گھر والوں سے ہوتی ہے کبھی ایسے دن بھی آتے

محدودے چند ہیں۔ لیکن انگریز سائنس دانوں اور محققین نے دُنیا کے ہر گوشے سے نباتات کے نمونے لاکر یہاں لگاتے اور ان پر مفید تجربات بھی کیے۔ اس اعتبار سے یہ باغ علم نباتات کے طالب علموں کے لیے ایک درس گاہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس باغ کی توسیع اور ترقی کے لیے خود باغ میں لگاتے جانے والے پودوں کی آمدنی سے بھی رقم حاصل کی گئی، اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ بلکہ آج تو ”کیو گارڈن“ نباتات کے کاروبار کے لیے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ پودوں کو بارشوں اور موسموں کے تغیرات سے محفوظ رکھنے کے لیے یہاں نہایت اعلیٰ سائنسی انداز میں اہتمام کیا گیا ہے۔ یہاں پیدا ہونے والی جڑی بوٹیاں بے شمار جدید دوائیوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ اور باغ کے منتظین کو اس سے لاکھوں پونڈز کی آمدنی ہوتی ہے۔

لندن میں آنے والے سیاح کے لیے اس باغ کو دیکھنا ”لازمی ضرورت“ ہے۔ اس طرح سیاحوں اور باغ میں آنے والے لوگوں کے داخلہ ٹکٹوں سے ہی اتنی آمدنی ہو جاتی ہے جو ضرورت کے لیے کافی ہے۔

کیو گارڈن کے علاوہ لندن کے مشہور اور خوبصورت باغوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہ باغ اپنی پھیلیں، پھولوں کے تختوں، سبزہ زاروں، درختوں اور سیاحوں اور بچوں کی تفریح کے لوازمات کی وجہ سے قابل دید ہیں۔ ہر باغ میں صاف ستھرے پتھر کے لٹیٹوران اور دوسری تفریح گاہیں بھی موجود ہیں۔ لندن کے بعض پارک جو پہلے شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھے، لیکن اب ہر خاص و عام کے لیے کھلے ہوئے ہیں، حسب ذیل ہیں:- سینٹ جیمز پارک، ہائیڈ پارک، کیننگٹن گارڈنز، کوئین میری گارڈن (یہ ریجنٹ پارک کے اندر) ایکڑ رقبہ میں پھیلا ہوا ہے) ان باغوں کی رعنائی اور دلفریبی کا کیا پوچھئے۔ یہ باغ تمام سال لوگوں کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ جھیلوں میں کشتی رانی کا بھی اہتمام ہے۔

کوتاہی نہیں بخشنے، ان کی اپنی مخصوص افادیت بھی ہے۔ یعنی خوبصورتی بھی اور پرکاری بھی۔ لندن کا مشہور ترین اور غالباً حسین ترین باغ ”کیو گارڈن“ ہے۔ انگریزوں کو فخر ہے کہ ایسا باغ دُنیا میں اور کہیں نہیں ہے۔ وہ اس میں حق بجانب بھی ہیں۔ یہ باغ ۲۸۸ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ یورپ، افریقہ، ایشیا کا کوئی ایسا پودا اور درخت نہیں ہے جو اس باغ میں موجود نہ ہو۔ نظر فریب اور خوبصورت درختوں اور پھولوں کے علاوہ یہ باغ نباتات کا ایک بہت بڑا مرکز بھی ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں اقسام کے درخت اور پودوں کے علاوہ کئی لاکھ سوکھے ہوئے پودے اور جڑی بوٹیاں بھی موجود ہیں جن کو حفاظت سے رکھنے کے لیے ایئر کنڈیشنڈ شیشے کے گھر بنائے گئے ہیں۔ ان گھروں میں تمام سال درجہ حرارت وہی رکھا جاتا ہے جو پودے کے لیے لازمی ہے۔ یہی نہیں، دُنیا بھر سے ہر سال ہزاروں نئے درخت، پودے، پھول اور جڑی بوٹیاں بھی یہاں لائی جاتی ہیں۔ دُنیا میں نباتات کی جتنی بھی قسمیں موجود ہیں، ایک دعوے کے مطابق وہ لندن کے ”کیو گارڈن“ میں موجود ہیں۔ پھر یہاں نباتات کے بارے میں مضامین اور معلومات پر مشتمل ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں نادر اور قدیم کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے۔ کسی بھی موضوع کا نام لیجئے۔ آپ کو لاتبریری میں کتاب دستیاب ہو جائے گی۔

اس باغ کا قیام ایک چھوٹے سے باغیچے کے طور پر عمل میں آیا تھا۔ ۱۷۵۹ء میں جارج سوم کی والدہ شہزادی آگسٹا نے اس مقام پر ایک چھوٹا سا باغ بنوایا تھا جس کا شاہی کے برعکس، جو محض خوبصورتی اور تفریح کے لیے ہی باغات بنواتے تھے، آگسٹا نے اس کے عملی اور افادی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ نباتات کی اقسام پر خاص طور پر توجہ دی گئی اور پودوں کے بارے میں نئے نئے تجربات بھی کیے گئے۔ بعد کی حکومتوں اور حکمرانوں نے بھی اس سلسلے کو جاری رکھا۔ انگلستان کے مقامی پودے، پھول اور درخت

چیلیسی گارڈن : ۱۶۷۳ء میں قائم ہوا تھا۔ پھولوں کے علاوہ جڑی بوٹیوں کے لیے بھی مشہور ہے۔

بیٹرسی پارک : اس باغ میں دوسرے پودوں کے علاوہ دُنیا بھر کی مختلف اقسام کے پتھروں کے ٹکڑے بھی موجود ہیں۔

ہیمپٹن کورٹ گارڈن : اس باغ کی مخصوص چیز یہ ہے کہ یہاں چھ سو اقسام کے انگور کے درخت موجود ہیں۔

بشتی پارک : دریائے ٹیمز کے کنارے پر ہے۔ ایک ہزار ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ سینکڑوں سال قدیم بلند و بالا اور خوبصورت قد آور درختوں کے لیے مشہور ہے۔ چھس وک ہاؤس : جھیلوں کے علاوہ یہاں چھوٹے چھوٹے ٹپل بھی بنے ہوئے ہیں۔

سیون ہاؤس : درختوں اور پودوں کی بے شمار اقسام کے علاوہ سبزہ زاروں اور خوبصورتی میں بھی الاجواب ہے۔ بہت وسیع و عریض پارک ہے

آسٹریلی پارک : اس باغ میں تین حسین جھیلیں اور مصنوعی جزیرے بھی ہیں۔

کین وُڈ ہاؤس : جھیلوں، درختوں اور پھولوں کے لیے مشہور ہے۔

گورنرے وِج پارک : نباتات کے ذخیرے کے لیے مشہور ہے۔

حسن درختانی میں بھی بے مثال ہے۔

مذکورہ بالا باغوں کے علاوہ لندن میں جگہ جگہ کھلے سبزہ زار اور باغ بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گنجان آبادی کے باوجود اس شہر میں گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ لوگوں کو تازہ ہوا اور آکسیجن کی بڑی مقدار بھی حاصل رہتی ہے۔ بچوں کو کھینے کے لیے میدان



مل جاتے ہیں۔ اور بڑے.... یوں تو ہر موسم میں باغوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، مگر موسم گرما میں اگر قسمت سے دھوپ نکل آئے تو یہاں کے لوگوں کی عید ہو جاتی ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں عورتیں، مرد اور بچے اوندھے سیدھے لیٹے دھوپ سینکے نظر آتے ہیں جو ان کے مکانات اور فلیٹوں میں انھیں حاصل نہیں ہو سکتی۔

فٹ بال یا و بال

فٹ بال انگریزوں کا قومی کھیل ہے۔ لوگ دیوانگی کی حد تک فٹ بال کے شیدائی ہیں۔ سارے ملک میں ۹۷ کے لگ بھگ فٹ بال کلب ہیں جو لاکھوں پونڈز کماتے اور خرچ کرتے ہیں۔ اچھے کھلاڑیوں کے معاوضے (محض ایک سیزن میں) لاکھوں پونڈز تک پہنچ جاتے ہیں۔ فٹ بال یہاں محض ایک کھیل ہی نہیں بہت بڑا کاروبار بھی ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کی روزی کسی نہ کسی طرح اس کھیل سے وابستہ ہے۔ فٹ بال کلب دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتے ہیں۔ فٹ بال کے میچوں پر باقاعدہ سٹم بازی ہوتی ہے اور لاکھوں کروڑوں پونڈز کی ہارجیت ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ غیر قانونی نہیں ہے۔ حکومت نے اس مقصد کے لیے قوانین بناتے ہوئے ہیں اور ایک اندازے کے مطابق حکومت فٹ بال کے میچوں پر لگاتی جانے والی سٹموں پر ہر سال دوسو ملین پونڈز بطور ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اس ٹیکس کی رقم سے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ”فٹ بال“ کا کاروبار اس ملک میں کتنے وسیع پیمانے پر جاری ہے۔ فٹ بال کاسینز یہاں سڑکیوں میں ہوتا ہے۔ موسم گرما میں کرکٹ کاسینز شروع ہو جاتا ہے۔ کرکٹ بھی کاروبار ہے مگر فٹ بال دلی بات نہیں ہے۔

مگر اب چند سال سے متعلقہ حکام فٹ بال کلبوں کے منتظمین قانون نافذ کرنے والے ادارے اور خود عوام بھی سخت پریشانی سے دوچار ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فٹ بال کے

میچوں میں ہزاروں لاکھوں تماشائی شریک ہوتے ہیں۔ مگر شاید ہی کوئی میچ ایسا ہوتا ہو جس میں ہنگامہ آرائی، مار پیٹ اور فساد نہ ہوتا ہو۔ چھوٹے موٹے ہنگامے تو خیر ہوتے ہی رہتے ہیں۔ چند درجن تماشائی زخمی ہوتے، دو چار درجن پولیس والوں کو چوٹیں آتیں، لوگوں نے میدان میں توڑ پھوڑ کی۔ بوتلیں اور بیٹر کے ڈبے پھینکے اور گھر چلے گئے۔ یہ تو معمول میں داخل ہے اور اس پر کوئی زیادہ ناک بھوں بھی نہیں چڑھاتا۔ مگر تشویش کی بات یہ ہے کہ اب فٹ بال میچوں میں بہت بڑے پیمانے پر مار دھاڑ شروع ہو گئی ہے۔ یہ میچ مختلف شہروں اور مختلف کلبوں کی ٹیموں کے مابین کھیلے جاتے ہیں۔ ہر ٹیم کے حمایتی ہزاروں کی تعداد میں گراؤنڈ میں موجود ہوتے ہیں۔ ہارنے والے جیتنے والی ٹیم پر ہونگ کرتے ہیں اور پھر ہارنے اور جیتنے والی ٹیموں کے مذاحوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ ایسے موقعوں کے لیے پورے ”مسح“ ہو کر جاتے ہیں۔ بوتلیں، ڈبے، پھل، جوتے تو معمولی بات ہے۔ پلاسٹک کی کرسیاں توڑ توڑ کر انھیں میزاتوں کے طور پر ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔ بے شمار لوگ شدید زخمی ہوتے ہیں۔ میدان میں بھگڑ مچ جاتی ہے۔ سیکڑوں بچے، بوڑھے، عورتیں اور کمزور لوگ اس میں پس کر رہ جاتے ہیں اور بہت سے ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔ اب تو یہ بھی ہونے لگا ہے کہ اس مار پیٹ اور جنگ وجدل سے دل نہیں بھرتا اور اسٹیڈیم کو توڑ پھوڑ اور نذر آتش کرنے کی کوششوں پر پولیس کسی حد تک قابو پالیتی ہے تو یہ گمراہ میدان سے باہر نکل کر دکانوں، بازاروں اور گھروں کا رخ کرتا ہے۔ یہ ایک سیلاب بلا کی طرح نازل ہوتے ہیں۔ راستے میں پارک کی ہوئی کاروں کو برباد کر دیتے ہیں۔ دکانوں اور پٹرول پمپوں کو جلا دیتے ہیں۔ بازاروں میں تباہی مچا دیتے ہیں۔ جدھر سے گزرتے ہیں چیخ و دھواں کی فوجوں کی طرح تباہی اور بربادی کے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

یہ قیامت تو تماشا تئیں اور شہر کے لوگوں پر گزرتی ہے۔ مگر کھلاڑی بھی ان لوگوں کے غیض و غضب سے محفوظ نہیں رہتے۔ جیتنے والی ٹیم کے کھلاڑیوں پر مارنے والی ٹیم کے ہمدرد آفت بن کر ٹوٹ پڑتے ہیں اور پولیس کی کوششوں کے باوجود بعض کھلاڑیوں کو جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔

گزشتہ دنوں جب فٹ بال میچوں میں یہ ہولناک ہنگامے عام ہو گئے تو ایک کلب کے میجر صاحب نے یہ ترکیب نکالی کہ تماشا تئیں کو میدان میں داخل ہونے سے روکنے کی غرض سے لوہے کے جینگے بنا کر ان میں برقی رو چھوڑ دی۔ ان کے اس اقدام کی مخالفت اور حمایت میں بہت شور مچا۔ کھیلوں کے وزیر نے کہا کہ اس طرح تماشا تئیں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتے گی۔ فٹ بال کلب کے میجر نے کہا کہ وزیر صاحب تو اناٹی ہیں۔ دفتر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ انھیں فٹ بال کے منتظمین کی مشکلات کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ شہر کے میئر نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی مگر فٹ بال کلبوں کے منتظمین اس کی افادیت کے قائل تھے۔ مگر عین وقت پر ایک عدالت نے حکم امتناعی جاری کر دیا اور اب یہ کام ادھورا ہی پڑا ہوا ہے۔

فٹ بال کلب والے کہتے ہیں کہ عام لوگوں کی جانوں کو نقصان پہنچانے کے علاوہ یہ ہٹ رولنگ چلانے والے پلاسٹک سیٹیں توڑ دیتے ہیں۔ زنجیر کو چاقوؤں سے کاٹ دیتے ہیں۔ جو چیز سامنے نظر آئے اسے میا میٹ کر دیتے ہیں اور اکثر اوقات عمارت میں آگ بھی لگا دیتے ہیں بعض کلبوں میں لکڑی کی سیٹیں ہیں۔ انھیں آگ کی نذر کرنا آسان ہے۔ چنانچہ آتشزدگی کی وارداتیں عام ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس جگہ فٹ بال کا میچ کھیلا جاتا ہے وہاں میدان جنگ کا نقشہ ہوتا ہے۔ سیکیورٹی پولیس والے کیل کانٹے سے لیس کر بستہ کھڑے ہیں (ان کیل کانٹوں میں محض دفاعی اشیاء ہوتی ہیں) فساد سے عہدہ برآ ہونے کے لیے زردہ بکتر اور آہنی ٹوپوں میں ملبوس پولیس "جنگ" کے

لیے تیار کھڑی ہے۔ آگ بجھانے والے منتظر ہیں۔ فوری طبی امداد فراہم کرنے کے لیے ایمبولینس کاریں تیار ہیں۔ ہسپتالوں کا عملہ بھی مستعد ہے کہ نہ جانے میچ کے خاتمے پر کتنے زخمیوں کی مرہم پٹی کرنی ہوگی۔ دکاندار اور شہری الگ سانس روکے بیٹھے ہیں کہ نہ جانے کب ہجوم کا مزاج برہم ہو جائے اور وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ سب دعائیں کر رہے ہیں کہ خدا کرے یہ مرحلہ خیریت سے گزر جائے۔ اور یہ سب ہو کس لیے رہا ہے؟ اس لیے کہ شہر میں ایک فٹ بال میچ کھیلا جا رہا ہے بھلا بتائے کیل نہ ہوا ایک آفت ہو گئی۔

ابھی حکام ان بڑھتے ہوئے ہنگاموں سے اور تباہیوں سے محفوظ رہنے کے طریقے سوچ ہی رہے تھے کہ مٹی کے دوسرے ہفتے میں ایک ایسا المناک واقعہ ہوا جس نے اگلے پچھلے تمام ہنگاموں اور فسادات کو ماند کر دیا۔ ہوا یہ کہ بریڈ فورڈ شہر میں شہر کی فتح منڈ فٹ بال ٹیم اور دوسرے شہر کی ٹیم کے مابین میچ کھیلا جانے والا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں دونوں ٹیموں کے مداح میدان میں موجود تھے۔ لیکن فتح کا یہ جشن موت اور بربادی کے ہنگامے میں تبدیل ہو گیا۔ اچانک سٹینڈز میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں نے ساری عمارت کو لپیٹ میں لے لیا۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ لوگ جانیں بچانے کے لیے بھاگے۔ جلتی ہوئی عمارتیں تماشا تئیں پر گرنے لگیں۔ دیواروں کے نیچے دب کر بہت سے لوگ مر گئے۔ ایک قیامت کا سال تھا۔ گھنٹوں آگ بجھانے والے اپنے کام میں مصروف رہے تب کہیں جا کر اس پر قابو پایا گیا۔

مشکل یہ تھی کہ سیٹیں لکڑی کی تھیں اور آتش بازی کی طرح جل رہی تھیں۔ ۵۲ کے قریب افراد جن میں بچے، بوڑھے، جوان سبھی شامل ہیں اب تک مرنے والوں میں گنے جانے والے ہیں۔ پہلے تو مرنے والوں کی شناخت ہی مشکل تھی مگر ایک ہفتے کی محنت کے بعد حکام نے ان کے ناموں اور پتوں کا کھوج لگا لیا۔ دو تین درجن کے لگ بھگ

زندگی بھر سخی شدہ چہرے یا ہاتھ بیروں کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے۔
 بریڈ فورڈ کے اس حادثے سے چند روز پہلے برنگھم میں بھی ایک میچ کے موقع پر
 خاصی ہنگامہ آرائی اور تباہی ہوتی تھی۔ فریق ٹیموں کے حامیوں نے وہ اددھم مچایا کہ
 گھوڑے سوار پولیس اور بکتر بند پولیس بلوانی پڑی اور درجنوں پولیس والوں کے علاوہ
 بے شمار تماشاچی بھی زخمی ہوئے۔ ایک اور جگہ تماشاچیوں کے ریٹے سے عمارت کی دیوار
 ٹوٹ گئی اور کھلاڑیوں اور منتظین کی درجنوں کالیں دیوار گرنے کی وجہ سے بلبے کا ڈھیر
 بن گئیں۔

بہر حال، جیسا کہ آپ جان گئے ہوں گے فٹ بال کے تماشاچیوں کا مسئلہ اب حکومت
 اور متعلقہ کلبوں کے اختیار سے باہر ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس مشکل کا حل
 کیا ہے؟ خود مار گریٹ تھیٹر بھی اس سوال کا جواب فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ فٹ بال
 کلبوں کے منتظین اور حکام پر مشتمل مشاورتی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ مگر کیا اس طرح اس
 روگ کا علاج تلاش کیا جاسکے گا؟ کسی کو اس سوال کا تسلی بخش حل نظر نہیں آ رہا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس غنڈہ گردی اور ہنگامہ آرائی کا سبب کیا ہے؟
 اسباب تو بہت سے اور مختلف ہیں۔ مثلاً لوگوں کا بدلتا ہوا رویہ، ان میں تشدد پسندی کا
 رجحان بڑھ رہا ہے۔ انگلستان جس پر انگریز فخر کیا کرتے تھے اب وہ انگلستان نہیں
 رہا۔ لوگوں میں قانون شکنی کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ معمولی باتوں پر توڑ پھوڑ اور فسادات
 روزمرہ کا معمول بن گئے ہیں۔ لیکن ایک بات پر بھی متفقی ہیں اور وہ یہ کہ اس دکھ
 کا سب سے بڑا سبب شراب خانہ خراب ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ تماشاچی شراب کے نشے
 میں دھت ہو کر ساتھ میں شراب کی بوتلیں اور ڈبے لے کر میدان میں جاتے ہیں۔
 بہک کر جذبات اور جوش میں فتح اور شکست کی صورت میں ایک دوسرے پر ٹوٹ
 پڑتے ہیں اور پھر انہیں کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ ایک ماہر نفسیات کے الفاظ میں

لوگ لاپتہ ہیں۔ مرنے والوں میں پورے پورے خاندان بھی شامل ہیں۔ ایک شخص
 اس کے نوجوان بیٹے اور ایک کسمن پوتا موت کی نذر ہو گئے۔ کلب بلبے کا ڈھیر بن چکا
 ہے مگر جلی ہوتی دیوار کے سامنے رشتے دار دوست اور سوگوار پھولوں کے گلدستے لاکر
 رکھتے ہیں۔ ہسپتال زخمیوں سے اٹ گئے ہیں۔ شہر سوگوار اور دیران ہو گیا۔ بیکارے
 کلب میں سوگ منایا گیا۔ مقامی حکام نے متاثرین کی امداد اور علاج کے لیے دو کروڑ
 پونڈ جمع کرنے کی ہم شروع کی ہے۔ حکومت نے بھی خیر رقم دی ہے۔ وزیر اعظم
 مسزیتھر، ملکہ اور دوسرے لوگوں نے اسے قومی سانحہ قرار دیا ہے۔ تحقیق کیے باتیکروٹ
 کے ایک جج کو مقرر کیا گیا ہے۔ پہلے خیال یہ تھا کہ کسی نے آتشیں بم پھینک کر آگ لگائی
 ہے۔ اب کوئی کہتا ہے کہ ایک شرابی نے جلتی ہوئی سگریٹ مینڈے کے نیچے پھینک دی
 اور پرائی کڑی کے سٹینڈ نے فوراً آگ پکڑ لی۔ لاکھوں پونڈز چندہ جمع ہو چکا ہے۔ اسکول
 کے بچوں نے اپنا جیب خرچ تک چندے میں دے دیا ہے۔ دوسرے کلبوں کی عمارتوں
 کے بارے میں احتیاط شروع ہو گئی ہے۔ ویلے میں جو میچ ہونے والا تھا اس کے لیے خاں
 اہتمام کیا جا رہا ہے۔ کلب والے کہتے ہیں کہ پرائی عمارتوں اور کڑی کے اسٹینڈز کو بدلنے
 کے لیے کروڑوں پونڈ کی ضرورت ہے۔ لیکن بھاری رقمیں یا تو مشہور کھلاڑی (ستار) لے
 جاتے ہیں یا پھر حکومت ٹیکسوں میں سمیٹ لیتی ہے۔ کلبوں کے پاس میدانوں اور عمارتوں
 کی مرمت اور اصلاح کے لیے کچھ نہیں بچتا۔

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ زخمیوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے جسم، ہاتھ
 پیر یا چہرے جھلس گئے ہیں اور انہیں کافی عرصہ ہسپتال میں رہنا ہوگا اور ہر شخص کو کئی
 کئی آپریشن کرانے ہوں گے۔ پہلے ہی دن بیس کے لگ بھگ زخمیوں کے آپریشن کیے
 گئے۔ اکثر لوگوں کی پلاسٹک سرجری ہوگی اور انہیں کئی بار تکلیف دہ آپریشن کے مرحلے
 سے گزرنا ہوگا۔ بعض لوگوں کے چہرے شاید کبھی ٹھیک نہ ہو سکیں اور بہت سے لوگ

”ان پر جنون طاری ہو جاتا ہے انھیں احساس ہی نہیں رہتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟“

ادب، تنقید

گویا بہت بڑا سبب شراب ہے۔ دوسرے اسباب بھی ہیں مگر بنیادی سبب یہی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جب مہذب، ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم کا یہ حال ہے تو پھر ہمارے ملک کے اُن پڑھ اور غیر ترقی یافتہ لوگ اگر کبھی بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس پر شور قیامت برپا کرنا کہاں تک جائز ہے؟ آسٹریلوی کرکٹ ٹیم کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس پر قومی اخباروں نے لکھا تھا کہ

”ہمارا سر دوسری قوموں کے سامنے شرم سے جھک گیا ہے“
واقعی شرمندگی کی بات بھی تھی لیکن لطف یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر تشویش اور فکر مندی کے جذبات تو نظر آتے ہیں۔ شرمندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔



جدیدیت کی تلاش
برسبیل تنقید
میر انیس کی قلمرو
بتجاہل کا لمانہ
یافت و دریافت
رویتے اور شناختیں
اردو ادب بیسویں صدی میں
زبان داغ
مکاتیب امیر مینائی
شعرا چنار
مرآۃ الشعر
شعر العجم اول
شعر العجم دوم
نگارستان فارس
سخندان فارس
بچوں کا ادب
ادبی خطوط
مہاجرات مکتب مالہ

ڈاکٹر وحید قریشی
ڈاکٹر انور سدید
ڈاکٹر انور سدید
عطاء الحق قاسمی
رشید امجد
رشید امجد
پرو قیس حق نواز
داغ دہلوی
مولوی حسن اللہ خان
عبدالعزیز خالد
عبدالرحمن
شبلی نعمانی
شبلی نعمانی
مولانا محمد حسین آزاد
مولانا محمد حسین آزاد
میرزا ادیب
محمد اجمل خان
عبدالعزیز خالد

قائد اعظم، پاکستان، سیاسیات

زاہد حسین انجم

ڈاکٹر صفحہ محمود

ہمایوں ادیب

عشرت رحمانی

عشرت رحمانی

ریشم احمد جعفری

ریشم احمد جعفری

ابوالکلام آزاد / ریشم احمد جعفری

آغا اشرف

آغا اشرف

آغا اشرف

عشرت رحمانی

ناصر نقوی

یونس ادیب

انسائیکلو پیڈیا قائد اعظم

پاکستان کی اہم سیاسی جماعتیں

ضیاء کے بعد

پاکستان سے پاکستان تک

تاریخ سیاست ملی

قائد اعظم اور ان کا عہد

خطبات قائد اعظم

آزادی ہند

پاکستان کا اسلامی پس منظر

روداد پاکستان

مرقع قائد اعظم

حیاتِ جوہر

معلوماتِ پاکستان

معلوماتِ قائد اعظم